

زس کے جانے کے بعد علی احمد ان سب کو تسلی دیتے۔

”گھبراو نہیں ٹھیک ہو جائے گا۔ بالکل ٹھیک ہو جائے گا سب کھلاو اسے سب لیکن سب کشمیر کا ہو۔ کلوکانہ ہو۔ ایلی بھاگ کر ایک سب لے آؤ۔ وہ دو آنے جیب سے نکال کر کرتے۔ بس سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ایلی کی ماں گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ مگر ایلی کلوکانہ لانا تھوڑا سارس نکال کر بچے کو دو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ کہتے ہیں تا انگریز۔ این اپل اے ڈے۔ کپس دی ڈاکٹروے، کیا سمجھے ایلی۔ اچھا تم اُو کے تو تمہیں سمجھادیں گے۔“

رفیقان آتی تو علی احمد نے روک لیتے ”رفیقان گھبر تو سکی۔ تو تو بام آباد کا سکندر اعظم معلوم ہوتی ہے۔ آندھی کی طرح آتی ہے بگولے کی طرح چلی جاتی ہے۔ اس طرح بھاگنے دوڑنے سے فائدہ اور پھر بام آباد میں یہ کوئی جگہ ہے کیا بالکل فضول بے کاری ہاں تو اچھا خاصاً آدمی بیمار پڑ جاتا ہے۔ اب دیکھو اندر نخا بیبا پڑا ہے۔ میری اپنی صحت تباہ ہو چکی ہے۔ تم بھی تو زرد پڑ رہی ہوں۔ کیوں؟“ رفیقان آنکھیں جھکائے مسکرائے جاتی۔ اچھا تو سکندر اعظم اب کی گرمیوں میں ہم تمہیں کشمیر لے چلیں گے۔ تم بھی اور نخا ہمی وہاجا کر یوں سرخ ہو جاؤ گے۔ جیسے جیسے

کور کی آمد پر وہ قہقهہ مار کر صحن اٹھ بیٹھتے ”آئیے مہاراج لو بھی یہ راجپوتانے کے شدھ سا بھی بھی آگئے۔ تم چاہے جا کر ساری ہمار کشمیر ہو کچھ فرق نہیں پڑے گا۔“ اور کور یہ بات سن کر بیٹھے کی رسی کی چاک بنا لیتی اور اسے گھما نے لگتی۔ علی احمد ہنسنے لگتے۔

اڈھر کور اور علی احمد کے درمیان ہنگامہ شروع ہوتا اڈھر ساتھ والے کمرے میں نخے کی حالت بد سے بدتر ہوئی جاتی۔ نخے پر ہاجر کا سر جھکا ہوتا۔ گالوں پر آنسو رواں ہوتے اور چارپائی کے پاس رفیقان چپ چاپ کھڑی ہوتی۔ اس پر ایلی زس کو بلا نے کے لئے بھاگتا۔

زس کو گھر آتا دیکھ کر ٹین کا سپاہی چاندکتا اور اپنی رزم گاہ کو چھوڑ کر نکل آتا پھر دفعایہ محسوس کر کے اس نے قمیض نہیں پہنی ہوئی علی احمد لپک کر اندر داخل ہوتے اور قمیض پہن کر زس کے روپ و آکھڑے ہوتے۔

”کیوں کیا بات ہے؟“ وہ کہتے ”غیریت تو یہ کیا بچے کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی ہے کہ آپ تشریف لائی ہیں۔ آپ کے آنے پر ہر شخص کا دل دھک سے رہ جاتا ہے۔ زس۔“ وہ مسکراتے۔

دفعاً انہیں خیال آتا۔ کہتے ”اگر آپ برانت مائیں زس تو پوچھوں کیا آپ کشمیر کی رہنے والی ہیں معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہی ہی ہی ہی۔“ ان کی باتیں سن کر حاجہ اندر لشکر کو کوڈ میں لے ٹھیک انہوںہاے جاتی اور فیقاں اسے سمجھاتی تسلی دیتی۔ ایلی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ہاجرہ روتی کیوں تھی۔ وہ کیون تو قع کرتی تھی کہ علی احمد اس کے بچے میں دلچسپی لیں۔

دلچسپی تو وہ لیتے تھے۔ اکثر ۲ کر دیکھتے بھی ”گھبراو نہیں۔“ مسکرا کر کہتے ”ٹھیک ہو جائے گا۔ گرمیوں میں اسے کشمیر لے چلیں گے۔“ لیکن ہاجرہ چاہتی تھی کہ نوکرانی کے بچے کسیماری کی وجہ سے آقا اپنی زندگی حرام کر لیں۔ زس سے باتیں نہ کریں۔ کوئے کشتی نہ لڑیں۔ یہ سوچ کر ایلی کو آقا پر نہیں بلکہ نوکرانی پر غصہ آتا تھا۔

پھر ایک روز علی احمد کو ایک ضروری خط موصول ہوا۔ خط پڑھتے ہی وہ اٹھ بیٹھے اور جلدی سے تیاری کرنے لگے۔ پھر وہ ہاجرہ کے کمرے کے دروازہ ہر آکھڑے ہوئے۔ ہاجرہ اور سب عورتیں بچے کے اوپر جھکی ہوئی تھیں۔

”کیا حال ہے؟“ وہ بولے۔ ”واہ تم ویسے ہی گھبرا جاتی ہو فضول۔ آخر بیماری جاتے جاتے ہی جائے گی۔ گھبرا نے کی کوئی بات نہیں بچے بیمار ہوا ہی کرتی ہیں یہ کوئی نئی بات نہیں۔ اچھا تو میں دو دن کے لئے سرکاری کام پر جا رہا ہوں۔ گھبرا نا نہیں دو روز کے بعد آ جاؤں گا ہاں ہاں۔ ایلی، ایلی یہ لو۔“ انہوں نے چند پیسے اس

کے ہاتھ میں تھا ویع ”خُرُش کر لیا۔ اچھا بھائی میں جاتا ہوں۔“

نخے کی حالت خراب ہوتی چلی جا رہی تھی۔ سانس اکھڑ رہا تھا۔ منہ سوچ رہا تھا۔  
ہاجرہ کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے۔ فیقاں کے ہونٹوں پر وہی مہمی شرارت  
آمیز نہیں تھی۔

فرحت چپ چاپ بیٹھی ابا کو جاتے ہوئے حیرانی سے دیکھ رہی تھی اور علی احمد  
بڑے اطمینان سے انہیں الوداع کہتے ہوئے تسلی دے رہے تھے ”کوئی بات نہیں  
میں جلد آ جوؤں کا سب تھیک ہو جائے گا۔“

آلہوں کے بعد علی احمد لوٹے۔ گھر میں داخل ہوتے ہی چلانے لگے۔ ایلی کی  
ماں تمہیں مبارک ہو جاتے تم تھانہ رہو گی۔ تمہارا ایک ساتھی گھر میں آجائے  
گا۔

”ہاں تم اس قدر خاموش کیوں ہو۔“ انہوں نے گھر پر چھائی ہوئی خاموشی کو  
محسوں کر کے کہا اور پھر جیسے یک دم کچھ یاد آ جانے پر یوں لے۔  
”ہاں نخے کا کیا حال ہے؟“

ہاجرہ کے منہ سے ایک دلبی ہوئی جیخ سن کر وہ گھبرا گئے۔

”اوہ۔ تم نے مجھے بتایا ہی نہیں مجھے تاروے دیا ہوتا کوئی آدمی بیچ دیا ہوتا تبت  
تبت۔ کتنا پیارا بچہ تھا۔ بے حد فسوس ہے۔“ انہوں نے آہ بھری۔ ”مگر اللہ کے  
کاموں میں کس کو دخل ہو سکتا ہے۔ صبر کے سوا چارہ نہیں اس طرح رونے سے کیا  
ہوتا ہے۔ رونا دھونا بے کار ہے۔ بالکل بیکار قسمت میں یونہی لکھا تھا۔“ قسمت!  
ہاجرہ نے ما تھے پر زور سے ہاتھ مارا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اس شام علی احمد صحن میں بیٹھے با تینی کر رہے تھے ”وہ اپنی استانی شام کوٹ کی ہے  
نا۔ تم جانتی ہو ن۔ نہیں جانتی۔ ہاں استانی جانتا ہے، کیوں ایلی جب تم میرے ساتھ  
دورے پر گئے تھے اور اس نے تمہیں مٹھائی کھلائی تھی یاد ہے ن۔ اس کی لڑکی ہے۔“

سولہ سال کی عمر ہو گی۔ کشمیر میں پرو رش پائی ہے۔ رنگ انار سا ہے۔ آخر کیوں نہ ہو۔ جس نے انماج کی جگہ بچلوں پر پرو رش پائی ہو۔ اس کا رنگ انہ سا کیوں نہ ہو گا۔ ساری بات طے ہو گئی ہے تا تھ خ مقرر ہو چکی ہے۔ میں نے سوچا تھا۔ ایلی کی ماں اتنے بڑے گھر میں اکیلی رہتی نہ ہے۔ کوئی تو صاحبی ہونا چاہئے۔ لوہس اب تیار ہو جاؤ۔ ایلی کی ماں۔ ہم سب علی پور جا رہے ہیں۔ ایلی کی دادی نے بلا یا ہے۔ سارا انتظام تمہیں کو کرتا ہو گا۔ ایلی کی ماں۔ تمہارے سوا گھر میں اور کوئی نہ ہے۔ ہی ہی ہی۔ وہ ہٹنے لگے۔

ہاجرہ کی آنکھیں بالکل ہی پتھرا گئیں۔ روپیانہ مسکرانے لگی اور ایلی علی پور جانے کی خوشی میں ناچنے لگا۔ ایلی کو بھائی کی موت پر چڑھاں نہ ہوا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اچھا ہی ہوا کہ نوکرانی کے گناہ کا نشان مٹ گیا۔ اب اسے کوئی یاد دلانے والا نہ تھا کہ وہ آسا ہے۔

علی پور جانے کی خبر سن کر ایلی کی توجہ اپنے ساتھیوں کی طرف مبذول ہو گئی اور وہ یوں بھل گیا جیسے کوئی بچہ کھلونا ملنے پر بھل جاتا ہے۔ نویں جماعت کا امتحان ختم ہو چکا تھا۔ اس نے علی پور جانے کی خبر اس کے لئے بے حد خوش کر تھی۔

### شہ بالا

علی پور پہنچتے ہی محلے والوں نے ایلی پر سوالوں کی بوچھاڑ کر ڈالی۔  
”کیوں ایلی کیا باب کی شادی پر آئے ہو۔ کیا کہتا ہے۔“  
”ایلی شہ بالا بننے گا اپنے ابا کا ہے نا۔“ — ”کیوں میاں تمہاری نظر میں بھی کوئی کشمیر کا سبب ہے۔ ابھی سے چنان کر لومیاں پھر پچھتا گے۔“  
”اے ہے ایلی بیٹے۔ سے مذاق کیوں کرتے ہو۔ وہ کیوں بنے شہ بالا کسی کا۔ اس کے تو دو لاہا بننے کے دن آرہے ہیں۔ بھی اسے دق نہ کرو۔“  
”کیوں بھی اماں کو ڈولی میں بٹھا کر کب لائے گا۔ ایلی۔“

ایلی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا جواب دے۔ ویسے وہ کوشش تو کرتا تھا کہ کوئی چمکیلی بات کرے لیکن ناجانہ کیوں اسے بات پر شرم محسوس ہونے لگتی اور اس کی آواز گلے میں خشک ہو کر رہ جاتی۔ اس پر عورتیں اسے چھیڑتیں۔

”لڑکے کی آنکھوں میں آنسو چلائے گے۔“

”اے ہے اس کے گلے میں تو آواز خشک ہو گئی۔“

”نبیلی ایلی برائے ماں۔ اس کا ایک ہے علی احمد تو ہے ہی ایسا۔“

”عورتوں کے بغیر اس کا وقت کتنا مشکل ہے۔ مگر بیٹا چاہئے کوئی آئے کوئی جائے گھر کا مالک تو ہی ہے اور گھر کی مالکہ تیری ماں بے احتمام۔“

”آن آنے جانے والیوں کو کون پر چھتا ہے ماں؟“

ادھر علی احمد کے گرد لوگوں نے حلقہ باندھ رکھا تھا۔ ”کیوں علی احمد نہ رہ سکا تو نبی شادی کے بغیر شرم نہیں آتی علی احمد۔ یہ کیا تیرے دو لہا بننے کا وقت ہے۔ مگر بیٹی جوان ہو چکی ہے۔ لڑکا دسویں پاس کر چکا ہے۔“ ”عیل احمد کوئی کشمیر کا سیب ہمیں بھی لا دو۔“

لیکن علی احمد کے حلق میں آواز خشک نہ ہوتی تھی نہ ان کا شہرہ زرد پڑتا اور نہ اسی ان کی زبان لڑکھڑاتی اور وہ سب کو کوئی نہ کوئی جواب دے کر خاموش کر دیتے۔ داروغہ سے کہتے بھائی داروغہ کشمیر کے میب لانے کی چیزیں نہیں۔ بھی وہ تو دال سے توڑ کر کھانے کی چیز ہے۔ ہمت ہے تو ہاتھ بڑھاؤ۔“

جانوں مالی سے کہتے ”الو مائی اللہ نہ کرے میں کیوں رہوں شادی کے بغیر مرد ہوں میں مرداور وہ بھی تیر بیٹا۔“

پھر جیواں آ کر چلا تی۔ ”علی احمد تیرے تو بال بھی سفید ہو گئے۔“

”ہاں ماں۔“ وہ جواب دیتے ”ول سفید نہیں ہوا۔ ابھی ایمان کی روشنی سے منور ہے اور اللہ رسول کی سنت کا لاحاظہ ہے۔“

”اے ہے۔ علی احمد۔“ جیواں نہ کر دو ہتر ڈمارتی ”تو تو بھائی ہی رہے گا۔ ساری عمر۔“ اور علی احمد ہستے اور جیواں چلاتی اور ان کا گھر قہقہوں سے گوئنے لگتا۔ اس وقت ایسا کو علی احمد سے عقیدت سی محسوس ہونی لگتی۔ ان کی باتیں سن کر وہ ان کے تمام قصور بخشن دیتا۔ اس کا بھی چاہتا کہ وہ بھی علی احمد کی طرح باتیں کر سکے لیکن بات کرتے وقت اس کی زبان اٹک جاتی تھی۔ گلہ بیٹھ جاتا۔ دل کو کچھ کچھ ہونے لگتا۔ اس کا بھی چاہتا تھا کہ بھاگ جائے دور جہاں کوئی نہ ہو۔ کوئی نہ ہو۔

علی پور پہنچ کر پہلے تو ہاجرہ بہت روئی تھی رورو کر اس نے براحال کر لیا۔ وہ تنخے کی باتیں کر سکے لیکن بات کرتے وقت اس کی زبان اٹک جاتی تھی۔ گلہ بیٹھ جاتا۔ دل کو کچھ کچھ ہونے لگتا۔ اس کا بھی چاہتا تھا کہ بھاگ جائے دور جہاں کوئی نہ ہو۔ کوئی نہ ہو۔

علی پور پہنچ کر پہلے تو ہاجرہ بہت روئی تھی رورو کر اس نے براحال کر لیا۔ وہ تنخے کی بات کرتے ہوئے آنسو بھاتی رہتی۔ ”اور پھر ایسا بحمدہار اور متھمل مزاج۔ رونا تو جانتا ہی نہ تھا وہ ہائے اتنی تکلیف وہ بیماری لگی اسے کتو بہے۔ زہرباد کوئی معمولی بیمار نہیں بہن۔ لیکن اس بچے نے اف تک نہ کی۔ رویا ہی نہیں۔ بس حیران نگاہوں سے چاروں طرف دیکھتا رہا کہ میں کہا آگیا جہاں میری کسی کو قدر نہیں۔ جہاں کسی کو میرے دکھ کی خبر نہیں۔“

ہاجرہ کے آنسو سرنوٹکنے لگتے اور وہ کچھ دریے کے لئے خاموش ہو جاتی۔ ”بیماری میں بھی اس کا مسکراتا نہ کیا۔ یوں مسکراتا۔۔۔ جیسے سیانے لوگ مسکراتتے ہیں۔ میں روئی تھی اور وہ مسکراتا تھا۔ بیماری نے اسے ذرا بھی مہلت نہیں۔“ ہاجرہ وہ رورو کر بچے کی باتیں کرتی رہتی اور پلو سے آنسو پوچھتی رہتی۔

ہاجرہ بار بار علی احمد کے بے حصی کا قصہ بیان کرتی رہی۔ ”نہیں اپنے شغل سے کام۔ کوئی مرے یا جئے ان کی بلا سے۔ نہیں تو کشمیری سیب کا عشق لگا تھا۔ کہتے

تھے۔ کشمیری سچاؤں پر پلی ہے۔ دویں پاس ہے۔ انگریزی فرفریوتی ہے۔ اچھا ہے بہن ہم بھی اس سے اٹھنا بیٹھنا۔ چنانا پھرنا۔ بات کرنا سکھیں گے۔ مجھے تو خوشی ہے بہن کہ گھر میں میم آئے گی۔ سچ کہتی ہوں۔ میرا خدا شاہد ہے۔ بہن مجھے کلمے کی قسم مجھے کوئی دکھنیں۔ بس یہی دکھنے ہے کہ نہ ھاتوں پڑپ کر مر رہا تھا اور میاں کو کشمیری سیب کی دھن لگی تھی۔ دوپیسے کی دواتک نہ منگوائی۔ نرس کو دیکھنے آتی تھی تو اس سے ٹھٹھے کے جاتے تھے۔ تو پہ ہے۔ گھر میں کوئی دم توڑ رہا ہوا لوگ اپنی حرص و ہوس میں کھونے ہوئے ہوں۔ کیا زمانہ آیا ہے۔ مجھے سوکن کا دکھنے نہیں۔ اس نخے پھول سے بچے کا دکھنے ہے۔ اور وہ اوسہ نور و نیکتی۔ اس وقت ایسی محسوں ہوتا کہ ہاجرہ بچے کا نامل ہے کہ نہ جانے کس دکھ کی وجہ سے رہ رہی ہے۔ سوکن کا دکھنے تھا تو وہ اتنی قسمیں کیوں کھاتی تھی۔ کلمہ کیوں پڑھتی تھی۔

پہلے تو ہاجرہ نخے کے لئے روئی اور علی احمد کے بے وفاںی کا گلہ کر کے آنسو بھاتی رہی پھر دھنٹا اس نے محسوس کیا کہ لوگ یہ نہ سمجھ رہے ہوں کہ وہ سوکن کی آمد کی وجہ سے روئی ہے اور بیٹھے کے بھانے اپنے لئے ہوئے سہاگ پر آنسو بھار رہی ہے۔ ہاجرہ سب کچھ برداشت کر سکتی تھی۔

یہ نہیں کہ لوگ اس کی قوت برداشت کا مذاق برداشت کا مذاق اڑائیں۔ اس پر خاوند پسندی کا جرم عائد کریں۔ اس لئے وہ خاموش ہو گئی اور اٹھ کر علی احمد کے بیاہ کی تیاری میں لگ گئی اور یوں شوق سے انتظامات کرنے لگی، جیسے خاوند کی بجائے اس کے بیٹھے کی شادی ہو رہی تھی۔ انتظامات پر وہ بات بات پر اعتراض کرتی۔ نہیں یہ تو کچھ بھی نہیں۔ میں دوہن کو یہ پہنچنے نہ دوں گی۔ دوہن کیا کہے گی۔ سرال والے کیا سمجھیں گے۔ اور یہ زیور تواب پرانا ہو گیا ہے۔ دوہن کے لئے نئی طرز کی چیز ہوئی چاہئے۔“

اماں کے اس انہاک اور شوق کو دیکھ کر ایسی حیران ہوتا تھا۔ لوگ حیران ہوتے

تھے اور حیرانی کا انظہار بھی کرتے تھے۔ ”ہاجرہ تم کیوں جان مارا ہی ہو۔ لخواہ مخواہ۔ چھوڑو کرنے دو آپ ہی اسے تمہیں کیا پڑی ہے۔ ایسا بھی نہیں ہونا چاہئے انسان کو۔“

یہ سن کر ہاجرہ کی آنکھ میں چمک سے ہبرانی اے ہے بہن اس میں کیا ہے۔ سو کون آئی ہے تو بکٹ شک۔ اپنے اپنے نصیب ہیں۔ جو اللہ نے نصیب میں لکھ دیا بسم اللہ۔“

اس پر لوگ اس کی طرف عجیب نکالوں سے دیکھتے۔ حیرانی شکوک میں بدل جاتی اور وہ سوچتے ضرور اس میں کوئی بھی ہے۔ ایسی بھی ان شکوک و شدت سے محسوس کرتا اور اسے اماں پر غصہ آتا لیکن کی تھیں نہ اتنا کوہ غصہ کیوں محسوس کر رہا ہے اور اس کے اپنے دل میں شکوک کیوں پیدا ہوتے ہیں۔ اس گھر کی تمام ترباتیں ہی مجھیں تھیں۔ صرف ایک دادی اماں تھیں جو گھر کی الجھنوں سے دور پیشہ کر مسکراتی رہتی تھیں۔

ایسی کو صرف دادی اس پر بھروسہ تھا جس کسی بات میں دل نہ دیتی تھی اور کھری کھری سنا دیتی تھی۔ ”علی احمد ری جل گئی پر بل نہ گیا۔“ اس نے علی احمد کی شادی کے متعلق صرف یہی ایک جملہ کہا تھا اور پھر خاموش ہو کر جائے نماز پر جا بیٹھی۔

گھر کے باقی تمام لوگ عجیب تھے۔ اما اپنی دہن میں کھوئے ہوئے تھے۔ اماں یوں کے کی حاجن بنی ہوئی تھیں۔ جیسے وہ انسان نہیں بلکہ فرشتہ ہو۔ صرف دو پروں کی کسر تھی اور سیدہ۔ کیسی چپ چاپ بیٹھی رہتی تھی۔ جیسے منہ میں زبان نہ ہو۔ مسکراتی بکھی تو ہونٹوں کے کونوں سے کسی کو پتہ نہ چلے۔

گھر کی ان الجھنوں سے اکتا کر ایسی باہر نکل جاتا اور محلے کے لڑکوں کو بلا کر سب کچھ بھول جاتا یا تو وہ ارجمند کے چاپا رے میں جا کر کھڑکی کی درز سے ہکورا لکھورا دیکھا رہتا یا محلے کے کنوئیں کے پاس کھڑے ہو کر انکراینڈی ماباؤں کو آزماتا یا جمیل

کے ساتھ جا کر ٹنگ لگی میں پیڑے کھاتا یا رضا کی دوکان پر بیٹھ کر اس کی اناپ شتاب  
باتوں پر ہستا یا بالا کے ہاں جا کر گراموفون سنتا اور یا محلے کے سب لڑکوں کو اکھا کر  
کے میدان میں گیند بیٹ کھیلنے میں مصروف ہو جاتا۔ ان مصروفیتوں میں دن بیت  
جاتا اور شام پڑ جاتی اور پھر داؤنی اماں کی آواز محلے میں گزشتی۔ ایسا اب تو آئے گا  
نہیں سارا دن اندرونیوں کی طرح پھرتا ہے۔ آب رات ہو گئی۔ ایسا۔ ”پھر وہ چکپے  
سے دبے پاؤں سیڑھیاں چڑھتا اور داؤنی اماں اسے دیکھ کر غصے سے چختی اور وہ بے  
خوف آگئے بڑھ کر اس کے کندھوں پر چڑھ جاتا اور وہ نہ سپتی اور پھر وہ دونوں  
ایک چار پالی پر سوچاتے اور داؤنی اماں اسے پتھریں ”سو جاند و رہیں کا۔“ اس وقت  
ابا یمپ کی روشنی میں مہاجنوں کی طرح حساب ملائے میں مصروف ہوتے۔ دو اور  
تین پانچ آٹھ۔ تیرہ یہ ہوئے دوسو تیرہ اور باجرہ چیزیں دیکھے ہوئے بڑھاتی ”لو یہ  
قیص کا کپڑا بلکل بے کار ہے۔ دوہن کیا کہے گی۔“ اور علی احمد چلاتے ”تو تو پا گل  
ہو گئی ہے۔ اٹھارہ روپے گز کا ہے۔ اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہے۔ دوسو تیرہ اوچھے  
سوچھیس یہ ہوئے گل ”

## دوہن

دوہن کی آمد پر محلے میں ایک شور مج گیا۔ چاروں طرف سے عورتوں نے علی احمد  
کے گھر کی طرف یورش کر دی۔

”آؤ بہن دوہن کو دیکھا گئیں۔“

”دوہن آگئی کیا؟“

”ابھی آئی ہے ابھی۔“

”ہائے میرا دوپٹہ کہاں ہے؟“

”کہتے ہیں کشمیر میں پلی ہے۔“

”سنا ہے وہ تو انگریزی فرفریوتی ہے۔“ اور وہ دوپٹے سن بھال کر علی احمد کے گھر کی

طرف چل پڑیں۔

دوہن کی آمد کی خبر سن کر ایلی نے جھر جھری لی۔ اس کے بدن میں بجلی سی دوڑگی اور وہ چپ چاپ کھڑے کا کھڑا رہ گیا نہ جانے کیوں وہ گھر جانے سے ڈرتا تھا۔

”اے ہے تو یہاں کھڑا رہا یا میں؟“ وہ اسے سہا ہوا کھڑا دیکھ کر بولیں ”اور تمہارے گھر میں اللہ کے مفضل سے نئی دوہن آئی ہے۔“

دوسرا بولی بہن اللہ کے فضل سے کیوں کہو۔ یوں کہو کہ علی احمد کے شوق کی وجہ سے۔“

پہلی بولی ”اب جو آجی نہ ہے تو اس پر اللہ کا فضل ہو۔ خوشیا ویکھے۔“

ایلی حیرانی سے ان کی باتیں سنتا تھا۔ عجیب باتیں تھیں ان کی۔ وہ علی احمد پر غصے سے بل کھاتیں اور ساتھ ہی ان کی نکیں مزاجی کی وجہ سے ان کی جانب کھینچی جاتیں۔ ہاجرہ سے ہمدردی کا اظہار کرتیں اور ساتھ ہی اسے سور دا لازام بھی سمجھتیں۔  
لتنی عجیب بات تھی۔

دوہن کو دیکھنے سارا محلہ علی احمد کے گھر اکٹھا ہو رہا تھا مگر ایلی محسوس کرتا تھا جیسے اسے گھر نہیں جانا چاہئے۔ اس میں گھر جانے کی ہمت نہ پڑتی تھی، لیکن آخر اسے گھر جانا ہی پڑا اور وہ چکے سے ایک کونے میں جا کھڑا ہوا۔ بخڑے کمرے میں عورتوں کے ہجوم کے درمیان پلنگ پر ایک سرخ رنگ کی گھڑی سی لپٹی ہوئی تھی دو حنا مالیدہ ہاتھ لٹک رہے تھے۔ لتنی رنگدار مہندی تھی نہ جانے مونگیا قمیض کی وجہ سے وہ اور بھی سرخ دکھائی دے رہی تھی یا شاید اس لئے کہ ہاتھ بہت سفید تھے۔ ایلی نے نفرت بھر جھر جھری محسوس کی اور منہ موز لیا۔

اوہر عورتوں نے اسے دیکھ کر شور مچا یا ”اے یہاں آ۔ اپنی امی کو سلام کراؤ کر۔“

”سلام جی۔“ اس نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کہا اور پھر سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

”اے ہے لڑکا سلام کہتا ہے۔ اسے پیار تو کر لے دوہن۔“

”اللہ رکھے تیرا بیٹا ہے۔“

”پلا پلا بیٹا مل گیا تھے یہ بھی کسی کسی کے نصیب میں ہوتا ہے۔“

مونگیا چادر تلے سے حتائی ہاتھا ایلی کی طرف بڑھا۔ اس نے سر جھکا دیا اور منہ موڑ کر سانس بند کر کے کھڑا ہو گیا تاکہ کار سے حتماً رنگ دکھائی نہ دے۔ یونہ آئے۔ سر تھکنے کے بعد وہ حتائی ہاتھا اس کے منہ پر آ لگا۔ مہندی کی بو کا ایک طوفان آمد آیا۔ اس کی آنکھوں میں سرخ ڈورے ڈور گئے۔ نہ جانے اس بو میں کیا تھا۔ ایلی کے جسم کا بند بندلوٹنے لگتا تھا۔ تاالتا بجھے لگتا۔ گھبر اکراں نے اپنا چپ پھٹرالیا اور صحن کی طرف بھاگا۔

”شرماتا ہے۔“ مائی جیواں چلاتی۔ بلاش میاں میاں لگا ہے۔“  
”دوسری بولی“ ایسا اچھا بیٹا ملا ہے جسے۔

ایلی وادی اماں کے تخت تک پہنچ چکا تھا۔ اس کا دل ماش کر رہا تھا۔ سر گھوم رہا تھا اندر وہ سب نہ رہی تھیں۔

”دیکھ آیا اماں کو۔“ وادی اماں نے کہا ”بیٹھ جا۔“ دیریک وہ خاموش بیٹھے رہے۔

”میں نے تیرے لئے کچھ رکھا ہوا ہے۔ وہاں مٹی کی ہندیا میں۔“ وادی اماں اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھر ریتے ہوئے بولی۔

ووسرے کمرے میں علی احمد مضطربانہ طور پر ٹھیل رہے تھے۔ بار بار وہ باہر نکلتے ”مائی جیواں تجوہ پتو پھر سے جوانی آ رہی ہے۔ ہلدی کا برتن کھاتی ہے کیا؟“ ”شرم کر علی احمد۔“ مائی جیواں نہستی۔ ”شرم کر،“ لیکن اس کے انداز سے ظاہر ہوتا جیسے وہ اس کے بے شرمی بے حد مسرورو ہو۔

چاپچی حاجاں چلاتی ”لے آ گیا تیرا کشمیر کا سیب۔ تجھے مبارک ہو علی احمد۔“

”کیوں چاپچی؟“ وہ جواب میں پوچھتے ”خمارے کا سودا تو نہیں کیا ہم نے۔“ وہ مسکرا کر کہتی ”علی احمد پہلے تو ہمیشہ مٹی پر گرا کرتا تھا۔ اب کی بار تو جیت گیا ہے۔“

”پسند ہے تمہیں چاپ گی؟“

”اچھی ہے۔ اپنی لڑکیوں کی طرح ہی ہے۔ بیچاری ناک نقشہ بر انہیں رنگ سفید ہے۔ انہیں کالی تو ہیں پر ذرا کھلی کھلی ہیں۔ بہر حال ناک نقشہ بر انہیں۔“

”تیرے ناک نقشے کی طرح ہے کیا۔“ چاپ گی بننے جا رہی تھی۔

کھانے سے فارغ ہو کی ایسا پھر دلوہن کے کمرے میں جاؤ اٹل ہوا اور چورچوری اسے دیکھنے لگا۔ سفید جسم سے چار پائی بھر کی ہوئی تھی۔ اسے صفائی رنگ بہت پیار الگتا تھا اور ان جانے میں وہ بھرنے جسم کو دیکھ کر بہت خوش ہوا کرتا تھا۔ اور تینیں ایک ایک کر کے چلی گئیں۔ پھر وہ دلوہن کے پاس جا بیٹھا۔ لفڑا دوپتے میں حرکت ہوئی اور ایک بڑا سا سفید منہ نگاہ ہو گیا اور وہ چوری چوری اسکی طرف دیکھنے لگا۔

”ہا گیں۔“ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کی امیدوں کے عالی شان محل کو پاؤں کی ٹھوکر سے چورچور کر دیا ہو۔ دلوہن کی آنکھوں میں فرق تھا اور اس کا چہرہ خالی ورق کی طرح سرسر کورا تھا۔ ایسا نے محسوس کیا جیسے اسے دھوکا دیا گیا ہو جیسے اس کی تو قعات کو ٹھکرایا گیا ہوا۔ اسے جان بو جھ کر غلط نہیں میں بتا رکھنے سے علی احمد کا کوئی خاص مقصد ہوگا۔ غصے سے اس کی کنپیاں بجھنے لگتیں اور وہ بھاگا۔ دور دو دلوہن سے دور اس جیتے جا گئے دھوکے سے دور باہر صحن میں پہنچ کر اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ کئی دن تو اس صدمہ کی وجہ سے وہ سخت اداس رہا۔ پھر اس نے اپنے آپ کو محلے کی زندگی میں کھو دیا تاکہ گھر کے واقعات کو دل سے بھلا کر اپنی خوشی کو محفوظ کر سکے۔

## نماز کمیٹی

اس زمانے میں علی پوری میں خلاف تحریک کے تحت نماز کمیٹیوں کا دور دو رہ تھا۔ مسلمانوں میں اسلام کے متعلق بڑا جوش تھا۔ ہر محلے میں نماز کمیٹیاں قائم ہو رہی تھیں۔ نوجوان لڑکے علی اصلح منہ اندھیرے جاگ پڑتے اور سردی میں ٹھٹھرتے ہوئے

ایک دوسرے کو جگاتے۔ پھر جلوس کی شکل میں شہر کا چکر لگاتے۔ محلے محلے پھرتے اور گا گا کر لوگوں کو جگاتے۔ نماز پڑھنے کی تلقین کرتے۔ لڑکوں کو نماز پڑھنے سے اس قدر دچپی نہ تھی۔ البتہ اکٹھے ہو کر گاتے ہوئے جگہ جگہ جانا۔ مجہد انہ انداز سے گومنا اور مجہد انہ شان سے للاکار للاکار گانیا غازی مصطفیٰ پاشا سال کی شان میں قصیدے پڑھنا اور امان اللہ خان کے گن گانا اور علی برادران کو سراہنا۔ ایلی کو یہ شغل بے حد پسند آیا۔ کیوں نہ پسند آتا محلے کے جوان اس بات میں شان افیاز سمجھتے تھے۔ جب وہ باہر نکلتے تو ان کا انداز عجیب ہوتا جیسے ہیر و ہوں۔ جیسے مصطفیٰ پاشا کا گیت گانے والے خود مصطفیٰ سال ہوں۔ جنہوں نے انہمانے کی زندگیوں سے بچنے کے لیے بھیس بدھ رکھا ہو۔ اس استغفار میں بھی شرکیت ہوتے تھے۔ رفیق، عظیم، غلام علی، ضیاء اور صدر لیکن صدر اور غلام علی کی حیثیت صرف تنظیمان کی سی تھی۔ وہ صحیح جائے لال ٹینوں کا انتظام کرتے۔ انہیں جلاتے پھر نعمتوں کی کاپیاں نکال کر گیتوں کی دھنیں قائم کرتے اور بالآخر چھوٹے لڑکوں کو گانے کا کام سونپ کر خود سکریٹ سلکا کر جلوس کے ساتھ چل پڑے۔

بڑے لڑکوں میں صرف عظیم تھا جو انتظامات کرنے کے علاوہ گانے میں بھی پیش پیش ہوتا تھا۔ ایلی عظیم کو دیکھ کر فخر سے پھولے نہ ساتا۔ اس کا لے، گانے کا انداز، گردن اٹھا کر چلنے کی عادت اور گاتے ہوئے اوہرا وہر دیکھنے کا انداز ایلی کو بے حد جاذب معلوم ہوتے تھے۔ اس کے گلے میں یا کندھوں پر ایک شان بے نیزی سے رو مال پڑا ہوتا تھا۔ جس پر کمبل بڑی شان سے لکھتا اور پھر گاتے ہوئے اس کی گردن کا زاویہ کس قدر خوبصورت معلوم ہوتا تھا۔ ایلی کا جی چاہتا کہ وہ بھی عظیم کی طرح بے نیازی سے چلے اور شان استغفاری سے گانے اور اس کا کمبل بھی ویسے ہی لٹکے۔ لیکن سردی کی وجہ سے وہ کمبل میں ٹھٹھرتا ہوا چلتا اور گاتے ہوئے اس کی گردن پھول جاتی اور آواز چھینتی اور کنپٹیاں درد کرنے لگتیں۔ ایلی کی آواز تو بہت بلند تھی لیکن اس

کے گانے میں مٹھاں نہ تھی۔ عام طور پر وہ آواز بہت اُنشی نکالتا اور ابتداء ہی میں ایسی سرقاوم کر لیتا جسے نبھانا مشکل ہو جاتا۔ پھر وہ سب اصرار کر کے اسیگانے والوں کے گروپ کا سردار بنادیتے۔ یہ بہت بڑا امتیاز تھا۔ اسی امتیاز کی وجہ سے وہ بہت سورپرے جاگ اٹھتا اور باہر نکل جاتا کہ نمازِ کعبہ کے لئے لیٹنہ ہو جائے۔

علی پور میں جب وہ جلوس کی صورت میں چلتے تو بند کھڑکیاں کھل جاتیں۔ چھتوں سے خما آلوں چہرنے جھانکتے مندیوں سے انگڑائی لیتھے ہوئے بازو و کھائی دیتے، بڑے لڑکے سکریٹ کاکش لے لے کر کھڑکیوں مندیوں اور چھتوں کی طرف دیکھ دیکھ کر منکراتے اور سما تھوڑی توں ہدایات دیتے رہتے۔ دریچوں سے ٹھیک آوازیں سنائی دیتیں۔ آج پر نیکھو تو نمازِ کعبہ کی ولادی ہیں۔ دیکھو۔“

## مسجد کے زیر سایہ

دو پھر کے وقت وہ ارجمند کے یہاں چلا جاتا اور وہ دونوں ”انگریزڈی ماباؤں“ کے تمام سامان سے لیس ہو کر کنوئیں کے قریب جا کھڑے ہوتے اور ہر آتی جاتی لڑکی پر انکدہ اینڈی چلاتے۔ ارجمند رشمیں رومال لہرا تا۔ اس کے ہونٹ بالسری پر رکھے ہوتے لیکن بالسری بجائے کی بجائے وہ کچھ اور ہی ظاہر کرتے اور وہ دبھی زبان سے کہتا ”اف! غصب ہے۔ قیامت ہے۔ اب لڑکپن چھوڑ دے ظالم چباب آنے کو ہے۔“

ان دونوں کو وہاں کھڑا دیکھ کر کنوئیں کے پاس والے مکان سے برتن بجھنے کی آوازیں آنا شروع ہو جاتیں پھر کوئی قہقہہ مار کر نہ ستی اور با آواز بلند کسی کو پکارتی ”عائشان آئے گی بھی یا نہیں۔ ہی ہی ہی ہی۔“ اس کے قہقہے سن کر ایسا کو علی احمد کا کمرہ یا داؤ جاتا اور وہ و پختے لگتا ”کیا ہر مکان میں علی احمد کا کمرہ ہوتا ہے؟ کیا ہر بندے دروازے کے پیچھے ٹھیک کے سپاہی چھپے ہوتے ہیں۔“

پھر دفعتاً نٹ کا پر وہ ہلتا اور ایک بھرے جسم کی لڑکی سامنے آ کھڑی ہوتی۔ ارجمند

کاروں مال پلتا بانسری نتیجیں کرتی۔ آنکھیں چم چمک کر دیکھتیں۔ بازو بغل گیرے ہونے کے اشارے کرتے۔

اس وقت ایلی کے ماتھے پر پسینہ آ جاتا۔ آنکھیں جھک جاتیں۔ دل دھک دھک کرنے لگتا۔ کوئی آنکھتا تو وہ اس انداز سے اوہڑا دھڑ دیکھنے لگتا۔ جیسے کسی اور کام میں مصروف ہو۔ جیسے اسے ارجمند سے کوئی تعلق نہ ہو۔ جیسے وہ راہ چلتے چلتے رک گیا ہو۔ اور نٹ کے پروے سے مسکراتی ہوئی نوجوان اڑکی کی موجودگی کا اسے قطعی علم نہ ہو جیسے وہ انگرائینڈی ما باؤں کے عمل سے قطعی ناما قتف ہو۔

اوہر ارجمند کا اسیں روماں اس کی گردن پر آگرتا بانسری کا زاویہ بدلتا اور وہ یوں آسمان کی طرف دیکھنے لگتا۔ جیسے اللہ سے لوگا کر اس کی حمد و شاء میں کوئی دھن بجا رہا ہو۔

اس کے باوجود آتے جاتے شکوک بھری نگاہوں سے انہیں دیکھتے اور پھر مسکرا کر آگے نکل جاتے۔ ان کے جانے کے بعد نٹ کے پروے کی اوٹ سے چھپی ہوئی اڑکی کا بازو یا آنکھ پھر سے باہر نکل آتی اور ارجمند کاروں مال پھر سے لمبڑا نہ لگتا۔ ایلی کا دل پھر سے دھڑ کنے لگتا اور اس کی پیشانی پھر سے پسینے سے بھیگ جاتی۔ اس خطرناک کھیل میں وہ زیادہ دری مشغول نہ رہ سکتے تھے اس لئے کہ آتے جاتے لوگ انہیں وہاں اس طور کھڑے دیکھ کر گھورتے تھے۔ شاید خطرناک ہونے ہی کی وجہ سے یہ کھیل ان کے لئے بے حد لچک پ تھا۔ حالانکہ ایلی کو کبھی اتنی مہلت نہ ملی تھی کہ وہ نٹ سے جھانکتے ہو پھر کے کو نظر بھر کر دیکھ سکے وہ صرف یہی جانتا تھا کہ وہ بڑا سا چہرہ سفید سفید ہے اور وہ بانہیں مخملیں گوشت سے لبالب بھری ہیں اور وہ آنکھیں بے حد کالی اور سوخ ہیں۔

پھر وہ دونوں کنوئیں کو چھوڑ کر پرانی حوالی تھی، جواب منہدم ہو چکی تھی۔ مشرق کی طرف چند ایک پختہ مکانات تھے۔ شمال کی سمت میں ایک گلی نکل گئی تھی، جس میں دور

تک کچھ مکانات بننے ہوئے تھے۔ یہ گلی آصفی محلے سے تعلق نہ رکھتی تھی۔ کہا جاتا تھا کہ پرانے زمانے میں آصفیوں کا کام کاج کرنے والے کمیں، یہ گلی انہیں کی تھی اگر چاب ان کی مجلسی حیثیت آصفیوں سے کسی صورت کم نہ تھی۔

پرانی حوالی کے میدا کے پرانے مشرق میں شاخوں کے چند ایک مکانات تھے۔ کنوئیں کے پاس ایک مکان میں سید آگر آباد ہو گئے تھے اور اس کے قریب چند کشمیری آبے تھے۔ اب آصفی محلہ مغربی حصہ تک محدود تھا۔ وہ پختہ و سعی میدان جسے منڈی کہتے تھے اس کا مرکزی حصہ تھا۔ آصفی لر کے حام طور پر اس مرکزی حصے میں کھلنے سے گھبرا یا کرتے تھے کیونکہ وہاں کھینچنے سے انہیں محلے کی عورتوں کی نگاہوں نے رہنا پڑتا تھا اور وہ بات پر اعتراض کرتیں۔ اسے نالی کا گند اچھاتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی۔ سارا دن بیاپاں چھینٹے اڑاتے رہتے ہو۔ چھوڑواں گندے کھیل کو۔ ”گلی میں کھلنے پر وہ چلاتیں۔ ”کسی کا سر پھوڑ کر اطمینان کا سانس لو گے تم یہ کیا شعیفوں کا کھیل ہے۔ ”منڈی میں انگرایمنڈی مباوں کا کھیل تو بالکل بیکاراں تو ریشمی رومال تک لہرایا نہ جا سکتا تھا۔ بانسری بجانا تو الگ چیز تھی۔ اگر وہاں ریشمی رومال لہرایا بھی جا سکتا تو بھی اس کا کوئی فائدہ نہ ہوتا کیونکہ منڈی کے گرد ہر بہنے والی لڑکیاں کھڑکیوں میں نہیں آسکتی تھیں۔ یا تو ان میں اس قدر جرات نہ تھی اور یا شاید حس ہی نہ ہو وہ دبے پاؤں چلتیں جیسے پاؤں کی آہٹ ان کی دشمن ہو۔ پنجی نگاہوں سے دیکھتیں۔ بند ہونٹوں سے مسکراتیں اور یوں آہستہ یوں چلتیں جیسے وہ لڑکیاں نہیں بلکہ چلتے پھرتے سائے ہوں اور پھر منڈی میں ہر آہٹ بوزھیوں کے کان کھڑے ہو جاتے۔

”کون ہے۔ اے ہے شریفوں کے بیٹے بھی اب بانسیاں بجائے لگے۔ میراثی بن گئے۔ کیا تو بہے کیا زمانا آیا ہے۔“

”ریشمی رومال لہراتے ہوئے شرم نہیں آتی کیا۔“ چاروں طرف بوزھیاں

کھڑکیوں میں آج ہوتیں۔ ”یہ ذرا دیکھنا مار کتے۔ چاپی حاجاں ذرا آؤ تو۔“

سارے محلے میں انگرایندی ماباؤں کے لئے صرف دو مناسب مقامات تھے ایک تو کنوئیں کے پاس مسجد کے قریب جہاں بڑی ڈیورٹھی تھی اور دوسرے پرانی حوالی کے میدان میں بڑی لائین کے نیچے her Line

## کپ اور کیپ

جب وہ دونوں لائین کے نیچے کھڑے ہوتے اور ارجمند بانسری کی سروں کو چھیڑتا تو دفعتاً عصمت اللہ کے مکان کی کھڑکی کی چلت کو حرکت ہوتی جسے دیکھ کر ارجمند زیر لب کہتا ”وہ مارا دیکھا جاوہ وہ جو سرچہ ہ کروالے۔“ پھر وہ چلت کی طرف دیکھ کر آنکھیں چپکاتا اور ایلی مخاطب ہو کر کہتا ”دیکھا ادھر بین بھی ادھر سانپ ناچنے لگا۔ اسے کہتے ہیں انگرایندی ماباؤں۔“

ارجمند کی باتیں سن کر ایلی خرم محسوس کرتا کیونکہ ارجمند کی شخص اس کی اپنی فتح تھی۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ سانپ کون ہے۔ کہاں ہے اور اس کے ناچنے کا مطلب کیا ہے۔ شق کی طرف تو وہ بھی دیکھتا تھا۔ مگر اتنی دور سے چلت کے پیچھے اسے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا پھر وہ دوسری جانب دیکھنے لگتا شاید سانپ ادھر ناچ رہا ہو۔

اسے یوں کھوئے ہوئے دیکھ کر ارجمند چلاتا ”نہیں یار۔ کیپ کپ سمجھے کپ کھڑکی میں آبیٹھی ہے وہ اپنی چلت وہاں دیکھا۔ افریا کس سخن سب کی چیز ہے بس سمجھ لو بالکل تیار ہے۔ ذرا سی کسر ہے ایک آنچ کی اگر ہماری ڈپنسری یہاں علی پور میں ہوتی اور کیپ کسی روز دوا لینے آنکھی تو سب ٹھیک ہو جاتا۔ معاملہ صاف ہو جاتا۔ لیکن اب یہاں ڈپنسری جو نہیں کیا کیا جائے۔“

ایلی محسوس کرتا کہ انگرایندی ماباؤں میں ایک ڈپنسری کا ہونا اشد ضروری ہوتا ہے۔ لیکن سوچنے پر اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ ڈپنسری اس سلسلے میں کیا مدد کر سکتی ہے۔ ڈپنسر یاں تو علی پور میں بھی تھیں۔ جہاں لمبی میزیں بھی ہوتی تھیں۔ میزوں پر روئی

کے پھاہے پڑے ہوتے اور کمپاونڈ ریچی لئے کھڑا رہتا۔ پھر بڑی بڑی بوتل میں اور وہ عجیب سی بوچے سو نگھنے سے انسان خواہ مخواہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ وہیمار ہے اور وہ ڈاکٹر جس کے ماتھے پر چکنیں پڑی رہتیں۔ ہاتھوں میں رہی کی ٹوٹیاں لگتیں۔ جو نہایت خشک آواز میں باقی رہتا تھا۔ اور مریضوں کی بات یوں ہے پروائی سے سنتا تھا۔ جیسے سن ہی نہ رہا ہو۔ ایسی جگہ کے ہونے سے پھلا کیا فائدہ ہو سکتا تھا اور فائدے سے ارجمند کا مطلب کیا تھا۔

”کیپ کیپ“ ارجمند کی آواز نکلیں کہ پھر چونکا اور کھڑکی کی طرف دیکھتا کھڑکی میں ایک زرد روشنی کا چہرہ دیکھ کر اس کا دل دھڑکنے لگتا اور وہ نگاہیں پھیر لیتا پھر ارجمند کا روپ مال ہلتا اور اس کے بالوں اور گالوں سے مس کرتا ہوا چھاتی پر آگرتا اور ارجمند اسے یوں گلے لکھتا جیسے کوئی جاندا ارچیز ہو۔ یہ دیکھ کر کیپ مسکراتی اور لوچدار آواز سے پڑوں کو بدلاتی۔ ”سکینہ، سکینہ۔“

وہ دونوں اسے کیپ کہا کرتے تھے۔ نام ارجمند نے تجویز کیا تھا تاکہ سننے والوں کو معلوم نہ ہو کہ وہ کس کے متعلق باقی کر رہے ہیں۔ ایلی جب چوگان میں اڑکوں کے ساتھ کھڑا ہوتا تو ارجمند اس کے پاؤں کر بھانے سے اپنے سر پر ہاتھ رکھ لیتا۔ جس سے ایلی کو معلوم ہو جاتا کہ کیپ کے متعلق کوئی بات ہے یا کیپ کھڑکی میں کھڑی ہے یا وہ چوگان کی طرف آ رہی ہے یا اس کے سکول سے آنے کا وقت ہو چکا ہے۔

اگر کسی خاص مصروفیت کی وجہ سے ایلی ارجمند کا اشارہ نہ سمجھتا تو ارجمند لوپی کے متعلق کوئی بات کر دیتا۔ ایلی ہم نے ایک کیپ خریدی ہے آؤ دکھائیں۔ غصب کی چیز ہے۔ ایسا خوبصورت رنگ ہے کہ تمہیں کیا بتائیں۔ واہ واہ دیکھو اور پھر جاؤ۔“

اس پر ایلی کی مسجد میں آ جاتا کہ کوئی بات ہے اور پھر ایلی کسی بھانے کھیل چھوڑ کر

ار جمند کے ساتھ چل پڑتا اور وہ دونوں پرانی حوالی کے میدان میں جا کھڑے ہوتے اور کیپ کھڑکی میں آ کر سکینہ کو آوازیں دیتی اور اب آواز بلند نہستی یا انگریزی پڑھتی یا ویسے ہی کھڑکی میں کھڑی ہو کر سکینہ سے باتیں کرنے لگتی۔

”کل چھٹی ہے نا۔ پرسوں نے سکول کا وقت بدل جائے گا۔ پرسوں سے نوبجے لگنے والے سکول اور وحائی بجے ختم ہو گا۔“

اس پر ارجمند چلاتا ”نوئڈ، نوئڈ“ اور پھر زیریں گلگت تا ”اور انگ ما بد ولت تین بجے ڈیوڑھی پڑیوٹی دیا کریں گے تاکہ حضور کا بابا قاعدہ استقبال کیا جائے جو حضور کے شایان شان ہو۔ اتنے میں کیپ کے کھڑتے ایک چھوٹ سی لڑکی مسکراتی ہوئی نکل آتی۔

ار جمند چلاتا ”کپ کپ مدھ بھری پیالی۔“

وہ خواہ نتوہ اہم رہاتی اور مسکاتی اور ان کے پاس سے گزر جاتی۔

”مدھ بھری پیالی۔“ ارجمند با آواز بلند کہتا ”چند سال کے بعد کیا غصب ہو گا۔ کیا قیامت ٹوٹے گی۔ کیا فتنہ بیدار ہو گا۔ اف پیالی پھالہ بن جائے گی۔ پتی پھول بن جائے گی۔ پتی پھول بن جائے گی کلکی کھل کر چمن ہو جائے گی کیا سمجھے ایں۔“

ایلی حیرت سے ارجمند کی طرف دیکھتا۔ ارجمند کی باتیں کس قدر دلفریب تھیں اسے کیسے اچھے فقرے یاد تھے اور وہ اردو کس بے تکلفی سے بولتا تھا۔ ”کاش، ایلی سوچتا“ میں بھی پانی پت جاتا اور وہاں سے خوبصورت زبان سیکھ آتا اور پھر میں بھی ایسے جملے بول سکتا۔ لیکن ایلی تو سیدھی سادھی بات کرتے ہوئے بھی جھینپ جاتا تھا پاگلوں کی طرح وہ کپ کی طرح دیکھ تو سکتا تھا لیکن بات کر سکتا تھا اور وہ پیالی تھی بھی تو بے حد خوبصورت۔ کس قدر سفید رنگ تھا اور اس پر سختی جھلکتی بھی تھی مگر وہ مدھ اس مدھ سے کس قدر مختلف تھی جو کیپ سے چھلا کرتا تھی۔ حالانکہ کیپ رعنائی اور حسن میں کپ کے مقابلے میں چیخ تھی۔

جب کپ لجائی ہوئی ان کے پاس سے گزرتی تو ارجمند نہس کے کہتا ”جان من کیا دوسال کے بعد بھی ہمیں یاد رکھو گی بھلانے دینا خاکسار کو۔“ کپ کھلکھلا کر نہس پڑتی اور ایلی دل گویا کھل کر پھول بن جاتا۔

ارجمند کہتا ”چلو بھئی اب ہو رہی ڈکوری کی باری ہے۔ دعا کرو سائز بڑا نہ ہو۔“ پھر وہ ارجمند کے گھر بند کھڑکیوں کی درزوں سے جھانکتے رہتے۔ لیکن عام طور پر ان کا شوق پورا نہ ہوتا اور سامنے کا دالان ویران رہتا۔ اگر کبھی کوئی عورت غسل کرنے آتی بھی تو ایلی کی آنکھیں آپ ہی آپ بند ہو جاتیں اور وہ محسوس کرتا۔ جیسے وہ جرم کر رہا ہو لیکن اس وقت اس کا دل پھر کتنا سیں تھر کتیں اور سانس مشکلے آتا۔ یہ کیفیت تکلیف وہ ہونے کے ماتھ ساتھ تحلیلت بھی تھی ایلی کی تمام مترادفس [میں] اس کیفیت سے وابستہ تھی۔ اس منظر سے نہیں وہ منظر صرف اُن لئے ضروری تھا کہ اس کی موجودگی سے ایلی کو یہ کیفیت حاصل ہوئی تھی۔

## سامنہ ریاں

ہو رہی کوری سے فارغ ہو کر ایلی جمیل کے یہاں چلا جاتا اور وہ دونوں مل کر روپے گنتے جو جمیل نے ماں کی صندوقتی سے چڑائے ہوتے ایک دو تین چاپھروہ مل کر منصوبے بناتے۔ منصوبے بناتے وقت سامنے چو بارے میں ایک لڑکی آ جاتی انہیں دیکھ کر لڑکی کونہ جانے کیا ہو جاتا۔ وہ اٹھ پڑھتی چارا یک قدم چلتی پھر لوٹ آتی پھر کھڑکی میں کھڑی ہو کر انگڑا یہاں لیتی پھر ساہانہ اٹھا کر اسے سینے سے لگاتی۔ گود میں بٹھاتی پھر وہ ناچنا شروع کر دیتی۔ ناچ ختم ہونے پر وہ پھر سے انگڑا یہاں لیما شروع کر دیتی۔ ازسرنو کھڑکی میں آ جاتی۔ دو پٹھا تار کر پھینک دیتی۔ بالوں کو لپیٹ لیتی پھر انہیں کھول دیتی۔ پھر دو پٹھا اوڑھ لیتی اور ازسرنو ناچ پڑھتی۔ ایلی نے کئی مرتبہ اسے دیکھا تھا۔ لیکن اس نے جمیل سے بات نہ کی تھی۔ نہ ہی اسے خیال آیا تھا کہ وہاں انگرایندی ماباؤں کا کھیل کھیلا جاسکتا ہے۔ کیونکہ اس کے نزدیک وہ کھیل تو

ار جمند کی موجودگی کا لحاظ تھا۔ جمیل کو ایسی باتوں سے کوئی پچھپی نہ تھی۔ فی الحال وہ تو ماں کی گٹھڑی میں سے روپے چرانے اور دوستوں کو پیڑے کھلانے کے دلچسپ مشغله میں کھویا ہوا تھا۔

لیکن ایک روز جمیل نے اس نیماں صفت لڑکی کو دیکھ لیا اور دیر تک اسے دیکھنا رہا۔ یہ نیا کھیل اسے بہت پسند آیا اور وہ دونوں شدت سے اس جوان لڑکی کی طرف دیکھنے لگے جو دوسران پنے اور ایسا کے لئے جمیل کے چاپارے میں انگرائینڈی ماباول کا ایک نیا باب کھل گیا۔ انگرائینڈی کے اس باب میں ایک عجیب و غریب خصوصیت تھی نہ تو اس میں ریشمی رومال ہلاکا پڑتا تھا اور نہ باشری بجائے کی ضرورت تھی۔ نہ پریم پتوں کی کتاب کھونی پہنچتی تھی۔ نہ سونہ صرف گھر کی کھول کر اس میں بیٹھ جاتے باقی سب کچھ وہ لڑکی خود کیا کرتی تھی۔ جب ایسی اکتا جاتا تو وہ گھر چلا آتا۔

جب وہ گھر کی سیڑھیوں کے قریب پہنچتا تو مذہبیاں اسے دیکھ کر کسی بہانے اپنا کام چھوڑ اکران کی ڈیوڑھی میں آ جاتی ”کہاں سے آئے ہو؟“ وہ اس کے قریب آ کر مسکراتے ہوئے پوچھتی اور اس قدر قریب آ جاتی کہ اس کے جسم کی بوائی کی ناک پر یورش کر دیتی اور مذہبیاں کا سنس اس کے منہ سے ٹکراتا ہوا محسوس ہوتا اور مذہبیاں ٹکلٹکی باندھ کر اس کی طرف دیکھتی اور اس کی بانیہیں ایسی کی طرف بڑھتیں اور گھبرا کر ایسی پیچھے ہٹ جاتا۔

”کہاں سے آئے ہو؟“ وہ اس کی برف بڑھنے لگتی۔

”بیہیں۔ بیہیں۔ ذرا باہر گیا تھا۔“ وہ کافی کتر اکر سیڑھیوں کی طرف بڑھتا اور پھر بھاگ کر اپر چڑھ جاتا۔ اسے یوں اور پر چڑھتے ہوئے دیکھ کر دادی اماں پوچھتیں۔ ”کیا ہے تمہیں ایسی۔ یوں بھاگ کر کیوں چڑھتے ہو سیڑھیاں جیسے کوئی پیچھا کر رہا ہو۔“

ایسی ڈر کر پیچھے دیکھتا کہیں وہ پیچھے تو نہیں آ رہی۔؟

”کیا ہے ان بیٹھیوں میں؟“ وہ پھر پوچھتیں۔

”کچھ نہیں دادی اماں کچھ نہیں۔“

مذیاں کو دیکھ کر اسے کبھی خیال نہ آیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ انگرایندی ماباؤں کا کھیل کھیل سکتا ہے اور ڈپنسری کے بغیر ہی کامیابی حاصل کر سکتا ہے نہ ایس ریشمی رومال کی ضرورت ہے اور نہ شعروں کی کتاب کی۔ لیکن اس کے ذہن میں کامیابی کی نہ تو آرزو تھی اور نہ یہ شور تھا کہ کامیابی کا مطلب کیا ہے اسے وہ لڑ کیاں بے حد پیاری لکھتی تھیں جو وور کسی کھڑکی سے جھانکتیں اور مسکراہٹ بھری نگاہ چھلا کر کھڑکی بند کر لیتیں۔ اسے وہ لڑکیاں پسند تھیں۔ جن کے پھروں پر اوسی چھائی ہوتی۔ ایسی لڑکیاں جن کی صورتِ رولی روئی ہوتی جانے والے اللہ کہہ کر بھاگ جاتیں وہ نہیں جو آگے بڑھ کر اسے گھیر لیتیں اور پوچھتیں لہاں سے آتے ہو۔

## مکلاوا

ایک دن جب وہ حسب معمول مذیاں سے خوف زدہ ہو کر بیٹھیاں چڑھ رہا تھا کہ اپانے اسے آواز دی۔ ”ایلی، وہ گھبرا گیا نہ جانے اپانے کیوں بلا یا تھا کہیں وہ بیٹھیوں کی بات سے واقف نہ تھے۔

ایلی ڈرتے ڈرتے قریب گیا ”آج تم شیم کے ساتھ شام کوٹ جا رہے ہو سمجھتے جاؤ تیاری کر لو۔“ علی احمد نے کہا۔ خوشی سے ایلی کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ ایک نئی جگہ جائے گا۔

## شام کوٹ

شام کوٹ کے نام سے وہ اچھی طرح واقف تھا۔ چونکہ صنیہ شام کوٹ کی رہنے والی تھی اگر چاہے وہاں جانے کا کبھی موقع نہ ملا تھا۔ اسی روز وہ شام کوٹ کو رو انہوں گیا۔ شام کوٹ کے نئے محلے میں اپنی نئی ماں کا گھر دیکھ کر اسے بے حد مایوسی ہوئی۔ ایک ڈیوڑھی کے پیچھے ایک چھوٹا سا نگ و تاریک صحن تھا جس کے پیچے دو کوٹھڑیاں

تحمیں۔ ڈیورٹھی میں ایک بوڑھی عورت چادر باندھے بیٹھی تھی۔ چادر میں وہ کس قدر بحمدی لگ رہی تھی۔ اس کا بیٹھنے کا انداز بھی تو عجیب تھا۔ جیسے وہ عورت ہی نہ ہو بلکہ کوئی بے حس گنوار مرد بیٹھا ہو۔

ایلی کو دیکھ کر وہ انٹھ بیٹھی۔ ”خیر سے بسم اللہ“ اور وہ اس کے منہ پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ ”بیٹھ جا۔ سن علی احمد کا کیا حال ہے۔ آپ کیوں نہیں آیا وہ۔ بہت بننے لگا ہے اب تو پہلے تو یہ بات نہ تھی۔ دو سال میری نعمتیں کرتا رہا۔ میری دلیز پر بیٹھا رہا۔ میری بیٹی کشمیر میں پیا ہے ہاں بیٹائی نازک ہے وہ اسے کوئی دکھنا ہو۔ ورنہ وہ مجھے اچھی طرح جانتا ہے۔ میں نے بھی عماری عمر سرکاری نوکری کی ہے۔ عمر بھرا استانی کا کام کیا ہے۔ تم آئے ہی تھنا۔ ہمارے سکول میں یاد ہے ناتھیں۔“

دفعتا ایلی کو یاد آیا۔ ہوں! یہ تو وہی استانی تھی۔ جو اس روز پر دے کے بچپنی کھڑی علی احمد سے با تینیں کر رہی تھی۔ ایلی نے گھن سی محسوس کی۔ کی بھی استانیاں اسی قسم کی ہوتی ہیں۔ کیا ان میں ذرا بھی جھگک نہیں ہوتی۔ کیا وہ مرسوں کی طرح چادر میں باندھتی ہیں۔

”لڑکے کے ذرا حق تو بھرنا۔“ استانی نے کسی کو آواز دی اور پھر اپنی آنکھیں بھری جاری کر دی۔ ”میں نے پورے پندرہ سال ملازمت کی ہے اللہ نہ کرے کوئی ضرورت نہ تھی۔ نوکری کرنے کا بس شوق تھا پڑھانے کا شوق۔“

اس کے لجھے سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس نے ملکہ تعلیم کی بجائے پولیس کی نوکری کی ہو۔ علی احمد کی بات کرتے ہوئے اس کے انداز سے معلوم ہوتا تھا جیسے اس کما حق واقف ہو۔ جیسے علی احمد کے متعلق اسے تکلفات کی ضرورت نہ ہو۔ اس کے باوجود یا شاید اسی لئے اس کی گفتگو میں نفرت کی جھلک تھی۔ بات بات پر وہ اپنے گھرانے کی عظمت کا ذکر چھیڑ دیتی اپنی بڑائی جاتی اور بالآخر اپنی بیٹی کی نزاکت طبع کی طرف اشارہ کر کے ایلی کو متنبہ کرتی اس کی بیٹی کو احتیاط سے گھر میں رکھیں۔ پھر

اس نے اپنے بیٹے کو آواز دی۔ ”قاسم“ اور ایک جوان لڑکا بابا ہر آگیا۔ ”یہ تیرا ماموں ہے۔“ وہ بولی۔ ایلی نے ماموں کو سلام کیا لیکن وہ حیران تھا کہ جس قدر استانی کا چہرہ اور انداز نسائیت سے خالی تھا، اس قدر قاسم کا مردانہ پن سے محروم تھا۔

اس گھر میں سب سے زیادہ قابل قبول شخصیت اس کی نئی ای شیم کی ہی تھی۔ شیم میں نتو استانی کی بیبا کی تھی اور نہ قاسم کی سی مجھولیت۔ البتہ ایلی کو ایک تکلیف ضرور تھی۔ جب بھی شیم اس کے پاس آتی تو اس کے چادر سے دو حصنا مالیدہ ہاتھ کلک آتے۔ جن کی سفیدی اور بھی دو حصیاں۔ ان ہاتھوں کو دیکھ کر ان جانے میں وہ محسوس کرتا جیسے کوئی جرم ہو گناہ کر رہا ہو۔ شیم محبت جتنا کے لئے اپنے حصنا مالیدہ ہاتھ اس کی طرف بڑھاتی اور ایلی اپنی جانب بڑھتا ہوا دیکھ کر گھبرا کر سہم جاتا اور دور ہٹنے کی شدید کوشش کرتا مگر بالآخر وہ دو حصائی ناگ اے اپنی لپیٹ میں لے لیتے۔ حصائے اس کے ذہن میں ایک طوفان سا اٹھتا۔ گروپیش دھنلا جاتے اور پھر شرم سے اس کا سر جھک جاتا وہ اپنی نگاہ میں ننگا ہو جاتا۔ ننگا اور شرمسار۔

اس طرح اس کی زندگی میں ہاتھوں کی اہمیت بڑھتی گئی۔ ماں کی اہمیت بڑھتی گئی اور اس کے ذہن میں حصائی رنگ کا جنسی زندگی سے تعلق استوار ہوتا گیا۔ ان کے گھر میکس جو عورت آتی تھی۔ اسے ہر اہ راست یا باپ سے تعلق ہوتا تھا اگر وہ ان کے بند کمرے میں جا پہنچتی تو بھی اور اگر وہ اس کے زد سے بچنے کی کوشش کرتی تو بھی۔ بہر صورت ہر عورت جو اس مکان میں آتی تھی اسے علی احمد سے تعلق ہوتا اشباتی یا منفی تعلق۔

لیکن اس زمانے میں اسے اثبات لفی کا شور نہ تھا۔ اس کے دل میں یہ جذبہ پیدا ہو جاتا کہ بند کمرے کے ٹلسماں کو توڑ کر ٹین کے سپاہی کے چنگل میں پھنسنی ہوئی عورت کو

نجات دلائے لیکن اس خیال کے ساتھ ہی خواہ مخواہ چند ایک خیالی تصاویر اس کے ذہن میں اتر آتیں اور وہ لا جوں پڑھنے سے مخلصی پانے والی حسین مان جسے چھوڑ کر وہ بھاگ رہا ہوتا اپنی گود سے حتیٰ باتھن کاں کر اشارے کرتی۔ ”ایلی۔ ایلی شہرو مجھے ساتھ لے جاؤ۔ ایلی۔“ اور حتیٰ باتھن کی طرف بڑھتے چلے آتے۔

شیم کے حتیٰ باتھوں سے ڈر کروہ قاسم کے پاس جا بیٹھتا گرچہ اسے قاسم قطعی طور پر پسند نہ تھا۔ پھر بھی اسے وہاں سلوں والیں ان تو میسر ہو جاتا تھا شے جانے قاسم میں کیا تھا۔ اس کے جسم پر بال نہ تھے اور یہ بات ایلی کو ناگوار تھی۔ اس کا صاف سنہرا جسم دیکھنے سے وہ کمزور تھا لیکن قاسم قمیض پہننے بغیر بیٹھا رہتا۔ اب وہ قاسم کو قمیض پہننے پر کیسے مجبور کر سکتا تھا پھر اس کی ماں امتیازی بھی تو بدن کو ڈھانپنے کے متعلق محتاط نہ تھی اس کی قمیض کے بٹن اکثر کھلے رہتے تھے۔ جس میں لٹا ہوا پا حمال جسم کسی بند کرے اور ٹین کے سپاہی کی غمازی کرتا تھا۔

برصیا کے جسم کی طرف دیکھ کر اسے کراہیت محسوس ہوتی۔ اس کے حتامالیدہ باتھوں کو دیکھا سے غصہ آتا۔ اسے حتا سے ہاتھ رنگنے کا کیا حق تھا۔ اسے ان بوتوں کو لٹکانے کا کیا حق تھا۔ شیدید نفرت سے گھبرا کروہ اندر کمرے میں جا گھستا جہاں وہ اڑکی شاد چپ چاپ بیٹھی کام میں مشغول ہوتی۔ شاد، عجیب نام تھا اس کا لیکن اس کا رنگ زرد کیوں رہتا تھا۔ حالانکہ چلنے پھرنے اور کام کرنے میں وہ بے انتہا تیز تھی۔ کس پھرتی سے کام کرتی تھی وہ سارے گھر میں صرف شاد ہی ایسی اڑکی تھی۔ جسے دیکھ کر اسے گھبراہٹ نہ ہوتی تھی۔ اس کی کئی ایک وجہات تھیں۔ ایک تو وہ پتلے دبلے جسم کی اڑکی تھی۔ دوسراے اس کا رنگ سفید نہ تھا اور تیسراے اس کے ہاتھ حتامالیدہ نہ تھے۔ حتامالیدہ ہاتھن کے لئے صرف اس صورت میں پریشان کن ہوا کرتے تھے جب ان کا رنگ گورا ہوا اور دیکھنے میں وہ گدگدے محسوس ہوں۔

چند دن شام کوٹ رہنے کے بعد وہ مکلا واں کروا پس علی پور پہنچ گیا اور چند ہی

دنوں کے بعد علی احمد اپنے جنائی ناگ لے کر واپس نوکری پر چلے گئے اور ایلی علی پور میں اکیلا رہ گیا۔

اس بات پر اسے بے حد سرگرمی۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ آزاد ہے۔ اسے علی احمد نے بند کمرے، ٹین کے پیاہی اور جنائی ناگوں سے نجات مل گئی ہے اور وہ مجرم نہیں ہے اس نے کوئی گناہ نہیں کیا۔

لیکن اس کے باوجود محلے میں کوئی ناقص ضرور ہو جاتا جس سے اس کے دل میں ان ہاتھوں کی یاد تازہ ہو جاتی۔ اس کے دل میں پھر لذت اور گناہ کا احساس ابھرتا۔

### چوزے اور گلدھ

جنائی ہاتھوں کے سحر سے بچنے کے لئے وہ گھر سے باہر نکلتا اور گھومتا پھرتا۔ ارجمند، جمیل یا سعیدہ کے گھر پہنچ جاتا سعیدہ ایلی کی خالہ زاد بہن تھی۔ حسن دین محلہ ڈاک میں ملازم تھے اور اکثر علی پور سے باہر رہا کرتے تھے۔ لیکن اگر علی پور میں ہوتے تو بھی ایسے محسوس ہوتا۔ جیسے وہ باہر ہوں۔ ان کی موجودگی اور غیر موجودگی میں چند افرق نہ تھا۔ اول تو وہ بات کرنے کے قائل ہی نہ تھے اور کرنے کی کوشش بھی کرتے تو وہ مکمل نہ ہو سکتی بلکہ ادھوری رہ جاتی۔

گھر میں داشت ہوتے ہی وہ ایک نظر سعیدہ کی طرف ڈالتے اور پھر مسکرا دیتے۔ یہی ان کی سب سے بڑی بات ہوتی جسے صرف سعیدہ سمجھتی تھی۔ اس مسکراہٹ میں ان کا احساس کمتری ادھوری کوشش اور سعیدہ سے قلبی تعلق سمجھی کچھ واضح ہو جاتا پھر وہ اپنی حاضری کے باوجود گویا مکان سے ناپید ہو جاتے اور سعیدہ اس مسکراہٹ سے اخذ شدہ احساس برتری میں پھولے نہ سماتی۔

سعیدہ کے مکان میں ہر وقت بھیڑ لگی رہتی تھی۔ اسے بھیڑ رکھنے سے بے حد دلچسپی تھی۔ وہ اپنی کھڑکی سے آتے جاتے کوآواز دیتی۔ ”رفیق کہاں جا رہا ہے تو۔

”فرحت تو آج آئی نہیں ادھر“ زبیدہ لوتم کہاں جا رہی ہو بازی  
نہیں لگے گی کیا، ”اونا میلی آج تو پارٹی کا بندو بست ہونا چاہئے۔“

سعیدہ زبیدہ اور آصفہ تینوں سگلی بہنیں تھیں۔ زبیدہ رحم علی سے بیاہی جا چکی تھی اور آصفہ مولانا عبداللہ سے ویسے تو تینوں بہنیں مزاج کی نکلیں واقع ہوئی تھیں۔ مگر سعیدہ میں بہت زیادہ مخلصی عنصر تھا۔ اس کا گھر بھی محلے کے مرکزی مقام پر تھا۔ وہ ادھر ادھر سے لوگوں کو بلا کر اپنے گھر میں آشنا کر لیا کرتی اور پھر وہاں تاش کی بازی شروع ہو جاتی۔ چور سپاہی یا بھاگی دیور کا کھیل چلتا۔ چور سے باقاعدہ ایک اکنی بطور جرمانہ وصول کی جاتی اور پھر یا کنیاں اکٹھی کو کے کچھ منکار کیا جاتا یا پکایا جاتا اور بالآخر سب لوگ مل کر کھاتے پیتے۔ اس خلکے درمیان سعیدہ کا گھر قہقہوں سے گوچتا۔ ایک دوسرے سے مذاق کئے جاتے فقرے کے جاتے۔

ویسے سعیدہ کے گھر میں تو روزہ ہی ہنگامہ رہتا تھا۔ لیکن کبھی کھار خصوصی طور پر مولود شریف کا اہتمام کیا کرتی تھی۔ فرش پر سفید چادر میں بچھائی جاتیں۔ گلاب چھڑکا جاتا۔ کھانے کو لا پیش اور ہان مہیا کئے جاتے۔ شام کو عورتیں اکٹھی ہو کر نعمتیں پڑھتیں اور مرد دور کسی جگہ بیٹھ کر سنتے یا قریب ہی کسی مقام پر چھپ کر دیکھتے۔ گانے کے علاوہ سعید کو ناخن کا بھی بے حد شوق تھا۔ اکثر وہ چند ایک قریبی بہنوں اور بھائیوں کو بلا کر گانے کی محفل جماليتی اور پھر سر پر طلے دارلوپی پہن کر ڈھولک کے ساتھ ناچتی اور اپنی حنائی ہاتھوں کو عجیب انداز سے لہراتی اور ایلی محسوس کرتا جیسے وہ کوئی جادوگر نی ہو اور حنائی ہاتھ کوئی جیتا جا گتا طلسہ ہوں اس وقت اس کی نگاہ میں گرد و پیش و ہندلانے لگتے اور وہ چپکے سے وہاں اٹھ کر اپنے گھر دادی اماں کے پاس پناہ لینے کے لئے آ جاتا۔

دادی اماں اسے تھپک کر سلاتی ”کچھ بھی تو نہیں ایلی۔ کچھ بھی نہیں سو جا اب“ لیکن دادی اماں کی تسلیوں کے باوجود یا شاید ان تسلیوں کی وجہ سیوہ محسوس کرتا

کہ کچھ ہے۔ نہ جانے کہاں کچھ نہ کچھ ہے ضرور ہے جو اسے پریشان کر رہا ہے۔ اس کے دل کے نچلے پر دوں میں لہریں لے رہا ہے۔ طوفان بپا کر رہا ہے۔ لیکن دادی اسے تھکے جاتی۔ ”سو جا کچھ بھی تو نہیں۔ سو جا۔“ اور بالآخر وہ سو جاتا اور پھر نہ جانے کیا ہوتا۔ اس کے سامنے حنایی تاگ پلکتے اور ایک بھاری پھر کم جسم ناچتا ناچتا اس کی طرف بڑھتا اور پھر دھڑکام سے اس کی چھاتی پر آگرتا اور اس کا دم رک جاتا اور وہ چیخ مار کر جاتا اٹھتا۔ دادی اماں بیٹھتیں۔ ”لیکن یہ تجھے ایلی۔“ دوڑ گیا ہے کیا۔ نہ جانے سارا دون کہاں کھیلتا ہے۔ کس مقام پر بیٹھتا ہے تو۔ تجھے جو کہا ہے میں نے کسی سخت مقام پر اونچا کر۔ رات کو قیودرنا ہی ہوا اس وجہ سے اب سو جا۔“ دادی اماں کو کیا معلوم تھا کہ وہ عمر کے کئی سخت مقام پر آپ پہنچا ہے۔

صحح سوریہ ایلی پھر باہر کل جاتا اور محلے کی زندگی کی کہماگہی میں کھوجاتا یا رہی عورتیں اس کی طرف اپنے جملی دار پنجے بڑھاتیں۔ ”ایلی ہے جیتا رہ بیٹھے۔ خدا عمر دراز کرے۔ تیری ماں کا کلیجہ بھنڈہ رہے میں کہتی ہوں۔“ وہ راز دارانہ طور پر ایلی جھک جاتیں۔ ”اللہ رکھے جائیداد کا وارث تو ہی ہے۔ تو ہی گھر کا مالک ہے اور یہ جو آتی جاتی ہیں۔ کلمونیاں یہ سب چڑیلیں ہیں۔ سب دفعان ہو جائیں گی۔ انشا اللہ تو ہی گھر کا مالک بنے گا۔ کھلئے جا رہا ہے۔ تو جانپھے جا۔ دو گھری کھلنا اچھا ہی ہوتا۔“ ”عورتوں سے فتح کروہ محلے کے کسی بوڑھے کے ہتھ چڑھ جاتا۔

”میاں ایلی کہاں ہیں وہ تیرے ابا آج کل۔ نیابیاہ کرنے کی تو نہیں سوچ رہا۔ وہ دماغ پھر گیا ہے اس کا لیکن بھی ایک خوبی ضرور ہے۔ اس میں محلے میں کبھی ایسی بات نہیں کی۔ خیر اپنے اعمال کا ہر کوئی خود ذمہ دار ہوتا ہے۔ لیکن یاد رکھ۔ اپنے ابا کے نقش قدم پر نہ چلنا۔ سمجھے۔ بڑا اچھا لڑکا ہے۔ لیکن اب محلے کے لڑکوں کے ساتھ مل کر تو بھی بگڑتا جا رہا ہے۔ اچھا جا کھیل جا۔“

ارجمند ایلی کو دیکھ کر ریشمیں رومال لہرا تا۔ ”اڑے یا ریس تھم تو سونے ہی رہتے ہو۔

ابھی ابھی کیپ اور کپ سکول جارہی تھیں۔ کیا بتاؤں آج کیا ٹھاٹھ تھے۔ غصب ہو گیا۔ سرخ قمیض جیسے خون سے رنگی ہو۔ ”دققتا پاؤں کی آہٹ سن کروہ چونکتا۔“ ”خا،“ وہ بات کاٹ کر کہتا ”ارے وہ دیکھو تو میاں پہلوان بھی آگئے وہ دیکھو کنونئیں کے پاس۔“

”وہ دیکھا سلام کا جواب دیا جا رہا ہے۔ کیا مجھے یہ ماتھے سے مکھی نہیں اڑائی جا رہی۔ اس وقت مکھی کہاں۔ کیوں ایسی ہے نا اور ذرا ہکوراڑا کورا تو دیکھو جب تک اس کلاک پر مانس نہیں چڑھے گا۔ یہ نہ نہ ہی کرتی رہے گی۔“ اور پھر وہ نئے چوزوں کی طرح سر جوڑ کر کیپ کپ کی بائیں لگانے میں دیر تک مصروف رہتے۔

ار جمند سے ملنے کے بعد وہ رفیق اور جلیل کے بیہاں چلا جاتا۔ رفیق تو زیادہ وقت سو دا خریدنے میں مصروف رہتا تھا۔ اس کا معمول تھا کہ صبح سوریے اٹھ کر پچھی پھوپھا اور خالہ کے گھر جا کر پوچھتا۔ ”خالہ جی کوئی چیز منگوانی ہوتی بتاؤ یہ ہے۔“ ”پچھی بازار سے کچھ منگوانا ہے کیا۔“ پھوپھا جی میں بازار جا رہا ہوں۔ دیر تک وہ بازار جانے کا ڈھنڈو رہ پہنچتا رہتا ساتھ ہی اس کی آنکھوں سے گلابی پھووار اڑتی رہتی اور نگاہیں چوری چوری گردوبیش کا جائزہ لیتی رہتیں پھر وہ سو سے اکٹھے کر کے اپناریشمی رومال جیب میں ڈال اور غزلوں کی کاپی تھا کر بازار چلا جاتا جب سوا اسلاف سے فارغ ہوتا تو وہ جلیل کی طرف جا پہنچتا اور پھو وہ تنگ گلی کی اڑکی اپنے گھر کی دلیز اور گلی میں جھاڑو دیتی اور چلا چلا کر باتیں کرتی رفیق کی آنکھوں میں بوندا باندی ہوتی اور جلیل وحشت بھرنے والوں سے اس کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکراتا اور لڑکی مسکراتے جاتی اور ایسی محسوس کرتا جیسے وہ کوئی دلچسپ سازش کر رہے ہوں۔

پھر یوسف آنکھا یوسف کے آنے پر نقشہ ہی بدلتا کیونکہ یوسف لڑکیوں کے وجود سے بے نیاز تھا وہ ان مسکاتے ہوئے جھانتے ہوئے لجاتے ہوئے پھٹے سفید چہروں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا تھا۔ اس کے آتے ہی تمسخرانہ حرکات کا

طفوں انہی آتا۔ جلیل اور رفیق اسے بناتے اور وہ جان بوجھ کر بننا جیسے کسی کا رلوں میں جان پڑ گئی ہو۔ ایسی محسوس کرتا۔ جیسے یوسف کو نبانے سے جلیل کا مقصد صرف اس لڑکی کو محفوظ کرنا ہوتا تھا جو نہ جانے کیوں لگی کے ایک مرے سے دوسرے مرے تک جھاؤ دینے پر تھی رہتی تھی۔

دوپہر کے وقت جلیل اور ایسی محلے میں لوٹ آتے۔ اس وقت محلے کی بوڑھی عورتیں چوگان میں بیٹھ کر کوئی نہ کوئی کام کیا کرتی تھیں۔ کوئی ازار بند نہیں۔ کوئی تاگے کے گولے بناتی۔ چوگان سے گزرتے ہوئے رفیق کی گردان جھک جاتی۔ اس کی آنکھوں کی بوندا باندی ختم ہو جاتی۔ اس کے ہونٹوں کا گیت ختم ہو جاتا اور اس کے چہرے پاس جا بیٹھتا صغری گردان تو ہمیشہ الہامی رہتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ہر وقت عجیب سی سرخی پھیلی رہتی اس سے بازو عجیب انداز سے لٹکتے رہتے اور ہونٹوں پر تیسم گیت کا سماں طاری رہتا۔ وہ مضطربانہ طور پر اوہرا اوہر ٹھلتا اوہرا اوہر دیکھتا اور پھر تھیڑ کے گیت کا کوئی بول ان جانے میں اس کے منہ سے نکل جاتا۔ ”حافظ خدا تمہارا۔“ اس وقت ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ کسی سے رخصت ہو رہا ہو۔ اس پر ایسی کی نگاہوں نکلے ایک پارسی حسینہ آکھڑی ہوتی اور س کا دل دھک دھک کرنے لگتا۔ ایسی کا جی چاہتا تھا کہ وہ صدر سے پوچھے کہ وہ پارسی لڑکی کیا ہوئی اور وہ گیت کیا پارسی لڑکی گایا کرتی تھی اور صغری کی آنکھیں سرخ کیوں رہا کرتی تھیں اور اس کے بازو ڈھرا یا کیوں کرتے تھے مگر ایسی کو صدر سے بات کرنے کی جرأت نہ ہوا کرتی تھی۔ کیونکہ صدر محلے کے بڑے لڑکوں میں سے تھا اور چھوٹے لڑکے بڑے لڑکوں سے ایسی باتیں نہیں کیا کرتے تھے۔ اگرچہ صدر کے انداز میں وہ معزز زپن نہ تھا جو عام طور پر بڑے لڑکوں میں پایا جاتا تھا۔ بلکہ اس کے رکھ صدر میں بے باکی تھی۔ خلوص تھا پھر بھی جلیل کو یہ باتیں پوچھنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔

صدر کی ایسیں بے باکی کی وجہ سے محلہ والیاں اسے بہت برا بھتی تھیں اور دادی

اماں تو صدر کا نام سنتے غصے سے چلانے لگتی۔ ”بد معاش کہیں کا شرابی۔“ دفع کرائے نام نہ لے۔ مردوں کہیں کا۔“ اور صدر بھی دادی اماں کے نام سے چڑھتا تھا۔ ”مردوں پڑھیا۔ کھڑکی میں گدھ کی برح بیٹھی رہتی ہے مرتبی بھی نہیں۔“ اور پچھل پوناش کا پٹا نہ بنا تے وقت اس کی آنکھوں نہیں یوں مصرت لہراتی جیسے پڑھیا کو وہ اس پٹا نے تلے ترپتے ہوئے دیکھ رہا ہوا اور دیوار پٹا نہ یوں مارتا کہ یا محسوس کرتا۔ جیسے دیوار کی بجائے پڑھیا کے سینے پر پھینک رہا ہے۔

اصفی محلے کی زندگی محلے شک و تاریک گلیوں، کوٹھڑیوں اور نانک چندا یہوں کی ریگتی ہوئی اونچی دیواروں سے گھرے ہوئے حاضرے میں مخصوص انداز سے دھڑکتی تھی۔

محلے کی بوڑھیاں صحیح سوریرے ہی بیدار ہو جاتیں اور کھڑکیوں میں چوکیوں پر گدھوں کی طرح ٹیٹھتیں۔ جوان اڑکیاں کوٹھڑیوں کی گھٹی گھٹی فضا میں تاریک والا نوں میں برتن مانجھ آنا گوند ہنے اور سر کا پلو سنبھالنے میں شدت سے مصروف رہتیں۔ اس تاریک اور گھٹی گھٹی فضا کی وجہ سے ان کے رنگ زرد تھے۔ چہروں پر مرد نی چھائی ہوئی تھی اور انداز سے بے حصی ٹکتی تھی۔ اگر کبھی کبھاراں کے چہرے پر جوانی کی چمک لہراتی بھی تو وہ کونے کی طرف منہ موڑ کر اپنا آپ سنبھال لیتیں اور پھر آنا گوند ہنے میں یا برتن مانجھنے میں مصروف ہو جاتیں۔

اصفی محلے میں صرف چند ایک مخصوص قسم کی آوازیں گونجا کرتی تھیں۔ محلے کی بوڑھیوں کی آوازیں ان کے چہروں کی گھر گھر، تاریک دلانوں میں برتوں کی کھنک، چوگان میں بچوں کا دبادبا شور محلے کی مسجد سے تکبیریں مردوں کی کھنکھاریں اور دبے پاؤں چلنے کی آوازیں۔ بند ہوتے ہوئے نانک چندی دروازوں کی چڑاؤں ٹھک چپکا دڑوں کی چینیں جوشام کو چوگان پر منڈ لایا کرتیں اور پھر ضیغفوں کے خرائے۔

ان جملہ آوازوں میں صرف ایک آواز الیٰ تھی جو محلے کی نصیحت سے مختلف تھی۔  
وہ بالا کا گرموفون تھا۔ جو کبھی بھار بالا کے آسیب زدہ کمرے میں گانے کی کوشش کیا  
کرتا تھا اگرچہ اس ماحول میں اس کی آواز گھٹ کر رہ جایا کرتی تھی۔

جب پہلی مرتبہ بالا کے گرموفون پر جانکی بائی الہ آبادی کے گیت کی آواز محلے میں  
سنائی دی تو محلے کی گدھیں جھپٹ کر کھڑکیوں میں آگئیں۔

”میں اپنے چھتی ہوں یہ کون چلا رہا ہے۔“

”نہ جانے کہاں سے آواز آ رہی ہے۔“

”اے ہے یہ تو عورت نہ ہے۔“

”لوچا پی گی وہ تو بالا نہ لگایا ہے کون رکاٹ۔ اے ہے ہے محلے میں باجے بجانا۔“

”تو بہ ماں آج تک تو یہ سننے میں آئی نہیں تھی۔“

”میں کہتی ہوں اس لڑکے کا دماغ چل گیا ہے۔“

”لڑکے کا کیوں بہن۔ قصور تو داڑھی والے کا ہے۔ جس نے اسے باجا خرید کے  
دیا۔“

اس روز محلے کی گھدیں دیر تک سراٹھا کر پر پھر پھراتی رہیں۔ لیکن بالا سے کچھ  
کہنا ممکن بھی ہوتا؟ بڑی سے بڑی جھاڑ جھپٹ سن کر بالا نہس دینے کا عادی تھا۔

”ہی ہی ہی ہی۔ چاپی ساتھ نے یہ تو وہ والا بابا جا ہے۔ ہی ہی ہی ہی۔ اچھا ہے  
نا۔ پورے دوسو میں لیا ہے اور یہ ریکارڈ جانکی بائی الہ آباد والی کا ہے۔ بڑا اچھا گاتی  
ہے۔ ماں جی ہی ہی ہی۔“ سنو تو ابھی اپنا نام بولے گی میں ہوں جانکی بائی الہ آباد  
والی۔ ہاں۔“

بالا کی بات پر بوڑھویں کے ہونٹوں پر ٹنسی آ جاتی۔ ”اے چھوڑ و چاپی۔ اس لڑکے  
پر تو آسیب کا سایہ ہے ساری رات جنوں کی محفل لگی رہتی ہے اس کے تخت پر۔“

”ہاں ماں اس کے بس کی بات بھی ہو۔ انگلیاں تو سو گھواس کی پلاوَ کی خوبصوراتی۔“

ہے ہاں۔“

بالا کی جگہ اگر اموفون خریدتا تو شاید اسے بجائے کبھی اجازت نہ ملتی۔ لیکن بالا کو روکتا۔ آسیب زده بالا کو محلے میں خصوصی درجہ حاصل تھا۔

## بیاہ

بالا کے گراموفون کے ولادہ کبھی کھار بیاہ شادی کے موقعوں پر محلے کی فضا میں تبدیل واقع ہوتی، لیکن اس میں بھی آوازوں کی نوعیت نہ بتتی تھی۔ ڈھولک توجیتی تھی اور ڈھولک کی ضرب میں جوان لڑکی کی مضطرب انکیوں کی ترپ بھی گنجتی لیکن گانے زیادہ تر بوڑھیاں ہی کاتین اور ان کی دھنیں اس قسم کی ہوتیں۔ وہ گانے معلوم ہی نہ ہوتے تھے۔ انہیں من کر محسوس ہوتا جیسے بہت سی چپکا دڑیں بھیا نک آواز میں چیخ رہی ہوں۔ جیسے کسی کی موت پر کوئی نین کر رہا ہو۔ وہی آواز میں لمبے سر گو نجتے اور محلے کی فضا کو اور بھی تاریک کر دیتے۔

اگر کوئی نوجوان لڑکی کوئی گیت گانے کی کوشش کرتی تو اس کی آواز اس قدر بیگانی سنائی دیتی تھی کہ جلد ہی شرما کریا گہرا کراس ناکام کوشش کو چھوڑ دیتی اور بوڑھیاں اپنی عظمت کو از سر نو محسوس کر کے پھر سے لمبی ادا سرود میں رو نے لگتیں۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود شادی کے موقع پر کچھ نہ کچھ تبدیل ضرور و قوع پذیر ہوتی۔ نا نک چندی دیواروں کی سیاہی گھل کر صاف ہو جاتی۔ کھڑکیوں میں سرخ دوپٹے لہراتے اور علی پور کا بینڈ باجا کچی حوالی میں نغمے بجا تا۔ اس رو محلے کے لڑکے بورڑی گدھوں کے منہوں سائے کو اپنے سرود پر محسوس نہ کرتے۔ گیس کی روشنی میں لڑکوں کے ریشمیں رومال لہراتے۔ سیاہ بودے چمکتے۔ جیبوں سے پریم سندلیں۔ کتابیں باہر نکل آتیں لڑکوں کی نگاہیں کھڑکیوں کے اروگرو ناکام منڈلاتیں لیکن یہ سب باقیں بیکار تھیں۔ کیونکہ محلے کی لڑکیوں کی مجال نہ تھی کہ وہ کھڑکیوں یا دروازوں میں آ کھڑی ہوں۔

لڑکے کچھ دینے کچھ لینے کچھ کہنے کے بہانے بیاہ والے گھر میں جا داخل ہوتے۔ تاریک ڈیوڑھیوں میں چھپ کر انتظار کرتے بھیڑ میں راستہ بنانے کے بہانے اندر ہیرے میں چلکیاں بھرنے کی کوشش کرتے۔ اس افراتفری میں چوڑیاں کھلتیں۔ مہندی والے ہاتھ کپڑوں میں پٹک جاتے ہم سنتے ”بائے میں مر گئی۔“ کی خیف آوازیں سنائی دیتیں، لیکن ان معمولی مگر ڈچپ باتوں کے سوا کچھ بھی نہ ہوتا۔

بیاہ شادی کے موقع پر ایلی کے لئے گھر جانا مشکل ہو جاتا تھا۔ جب وہ اپنی اندر ہیری ڈیوڑھی میں پہنچتا تو ایک دھندلی سی شکل ڈیوڑھی کے کسی کونے سے نکل آتی۔ گھبرا کروہ رک جاتا تو دھندلی شکل گھوم کر اس کا راستہ روک لیتی۔

”کون ہے؟“ وہ چلاتا۔ ”ذر گئے۔“ نذریاں کی اواز آتی اور وہ مڑ کر ڈیوڑھی سے باہر نکل جاتا اور ارجمند کو ڈھونڈنے کا تا۔

”ہمیلو ایلی ہے۔“ ارجمند چلاتا ”مر اسرے“ معنی ہے۔ ایلی۔ برات والے گھر جانا بے معنی ہے۔ بیکار ہے میں نے چلکی بھری تو ظالم کہنے لگی۔ کہوں چاچی سے۔ ہاتھ جوڑ کر جان چھڑائی پھر مسکرانے سے بھی باز نہیں آتیں۔ اگر واقع کے سے جج کر کے آئی ہیں یہ لڑکیاں تو پھر دیکھ کر مسکراتی کیوں ہیں اور مسکراہٹ بھی خالص ڈپنسری والی اور چلکی بھرو تو چاچی سے کہہ گی۔ لا حول ولا قوۃ۔ چل کپ اور کیپ کی طرف چلیں۔ محلے سے بات نہیں ہے۔ آج بانسری پر ایک دھن سیکھ کر آیا ہوں۔ واہ کیا دھن ہے۔ بس سمجھ لو کچا دھا گا ہے جس سے سر کار بندھی آئے گی۔ آؤ سناؤں تمہیں۔“

نہ جانے کیوں ایلی نے نذریاں کی بات کبھی ارجمند سے نہ کی تھی۔ بلکہ وہ ڈرنا تھا کہ ارجمند کو نذریاں کی بات کا پتہ نہ چل جائے۔ تاکہ وہ رنگیں انگرایندی ماباؤں کا کھیل حقیقت کا روپ نہ دھارے ایلی کو ہلتی ہوئی چتوں سے دچپی تھی۔ مسکراتے

ہوئی آنکھوں سے دلچسپی تھی۔ معنی خیز انداز سے حرکت کرتے ہاتھوں کو دیکھنے کا شوق تھا۔ لیکن عورت یا لڑکیوں کا قرب اس کے لئے سوہان روح تھا۔ اسے ڈر تھا کہ مذیراں کی بات سن کر ارجمند کی توجہ اس طرف منعطف ہو گئی تو وہ زنگی ختم ہو جائے گی۔ اور نہ جانے کیا شروع ہو جائے۔ اس کے ذہن میں قرب کا مفہوم تاریکی تھا۔ پہ اسرا رخونا کرتا رہی۔

ایلی کے گھر میں تیاریاں ہونے لگیں۔ جانے کیا ہونے والا تھا۔ بات سمجھ میں نہ آتی تھی۔ لیکن پچھو ہونے والا ضرور تھا۔ اسی لئے تو علی احمد پچھلی لے کر علی پور آگئے تھے۔ اور وادی اماں کو پاک نہ تھا کہ اس سے پوچھتا پوچھ کر نہ جانے رجسٹر میں کیا لکھ رہے تھے اور ہاجرہ کو ٹھڑی میں کھر کی رو رہی تھی۔ نہ جانے اسے کیا ہوا تھا۔ وہ یوں رونے کی عادی نہ تھی۔

علی احمد نے تو کبھی وادی اماں سے بات نہ کی تھی۔ ماں بیٹے اس مکان میں اجنبیوں کی طرح زندگی بسر کیا کرتے تھے۔ وادی اماں سارا دن سیدہ کے قریب اکڑوں بیٹھی رہا کرتی تھی اور علی احمد اندر بیٹھ کر حلقہ پیا کرتے تھے اور رہروں میں لکھنے میں مصروف رہتے تھے دونوں کی آپس میں کبھی بات نہ ہوتی۔ ایلی اکثر حیران ہوا کرتا کہ یہ کیسے ماں بیٹے ہیں ایک دوسرے سے بات بھی نہیں کرتے۔ اگر کوئی وادی اماں سے علی احمد کی شکایت کرتا تو وہ اطمینان سے جواب دیتیں۔ ”علی احمد کی تو عادت ہی ایسی ہے۔“ اور پھر مسکرا دیتیں جیسے اظہارنا رانسگی کے باوجود انہیں علی احمد کی وہ بات پسند ہوا اور علی احمد کبھی وادی اماں کو بلاستے بھی تو پوچھتے۔ ”بھی وہ فلاں کا م کرنا ہے کیا کیا رسیمیں ادا کرنی ہوں گی۔“ اس کے سوانحوں نے کبھی وادی اماں کو نہ بلا یا تھا۔

اندر وادی اماں کہروں اور زیور کی بات کر رہی تھی نہ جانے کس کے کپڑوں اور زیور کی بات ہو رہی تھی۔ لیکن اماں ان کی بات سن کر روکیوں رہی تھی۔ کپڑے

اور زیور کی بات پر رونے کا کیا مطلب۔ پھر اتفاق سے سعیدہ آگئی اماں پھوٹ پڑیں۔

”لوڈر کی کی قسم ہی پھوٹ گئی میں تو جانتی ہی تھی وہ اپنے رشتہ داروں کے گھر میری پنجی پھینک دے گا۔ سو وہی ہوا۔ میری پنجی کو نیروز کے بیٹھے اجمل کے لپے باندھ رہے ہیں۔ ہائے میری تو قسم ہی پھوٹ گئی۔

اجمل ایلی کو پھوپھی کا لڑکا تھا وہی اجمل جو روہتک میں چند ایک ماہ کے لئے ان کے ہاں ٹھہرا تھا۔ جسے علیا ہم نے بال بنانے اور بن ٹھن کر رہنے پر مار کر نکال دیا تھا۔ ایلی کو جبھی کے اجمل نے ہمدردی تھی۔ اس کی شکل و صورت بھی ایلی بہت بھاتی تھی اور پھر اس کا لڑکوں سے میل جوان اور بیانی ربط بھی ایلی کو بے حد پسند تھا اور اب تو وہ بہت بڑا ہو چکا تھا اور وہ ایک سال ایران میں نوکری کرنے بعد لوٹا تھا۔ نہ جانے اماں کو اجمل کیوں ناپسند تھا نہ جانے اماں روتنی کیوں تھیں۔ اخراجمل میں کیا برائی تھی۔ اماں کا مسلسل روئے جانا ایلی کے لئے باعث حیرانی تھا! اماں بھی تو عجیب باتیں کیا کرتی تھیں۔ ایک طرف تو اس بات پر اس قدر ناخوش تھی اور دوسری طرف انتظامات میں مشغول تھی۔ جیسے بہت دلچسپی لے رہی ہو۔ فرحت کے کپڑے سیقی دو لہا کی چیزیں بھی تیار کرتی جاتی۔ علی احمد کے احکامات بھی دوڑ دوڑ کر منتی اور ساتھ ساتھ آنسو بھی چھلاکائے جاتی۔ عجیب عادت تھی اماں کی پھر ہر آتی جاتی۔ سے شکایت بھی کرتی جاتی کہ فرحت کا بیا زبردستی کیا جا رہا ہے۔

اوہ فرحت کو بھی احساس نہ تھا کہ اس کی شادی ہو رہی ہے۔ فرحت کی عمر کچھ زیادہ نہ تھی اس نے ۲۰ ٹھویں جماعت تک مدرسے میں تعلیم پائی تھی پھر علی احمد نے دفعتاً اعلان کر دیا تھا کہ اسے سکول جانے کی اجازت نہیں بچیوں کے لئے اتنی ہی تعلیم کافی ہے۔ اس پر فرحت پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی اور ہاجرہ نے اس کے ساتھ مل کر آنسو بھائے تھے۔

مگر علی احمد کا حکم اُنل تھا ان دونوں کے آنسو کام نہ آئے اور فرحت کی تعلیم کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ آٹھ سال سکول میں پڑھنے کے باوجود فرح ابھی بھی بھی تو تھی وہ اکثر محلے کے چوگان میں جا کر کلکی کلیر دی ناچتی رہتی۔ ساتھ ساتھ کچھ گلنگانی اور محلے کے بزرگ اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ فرحت تو کھونی۔ اور بیوڑھیاں مسکرا کر کہتیں ”فرحت تو فرحتو ہی رہی۔“ میلے نے کبھی محسوس نہ کیا تھا کہ فرحت بڑی ہو گئی ہے اسے بھی وہ فرحت ہی دکھائی دیتی تھی۔ اس میں عورت کا نام و نشان تک نہ تھا۔

اپنے بیاہ کی بات سن کر فرحت نے چوگان میں جانا بند کر دیا۔ اب وہ خالہ کے گھر بھی نہ جاتی تھی لیکن اس تبدیلی کے باوجود اکل میں وہ پیدا نہ ہوئی تھی جو جوان لڑکیوں میں ہوتی ہے۔

پھر وہ دن آپنے چاہی جب ان کے گھر کے سامنے باجے بجھنے لگے اور گھر میں مهمان آ جمع ہوئے اور بآجرہ کام کا ج میں اس قدر مصروف ہو گئی کہ آنسو بہانا بھی بھول گئی اور محلے کے لڑکوں نے بہانے بہانے ان کے گھر آنا شروع کر دیا اور برتن بجھنے لگے۔ حتاً ہاتھ ریشمی دوپٹوں میں سے باہر نکلنے اور چھیننے لگے اور گھر میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا اور بالآخر فرحت کو ڈولی میں بٹھا دیا گیا اور ایلی اور بآجرہ دونوں ڈولی کے ساتھ ایک نئے گھر میں چلے گئے۔ یہ نیا گھر اجمل کا گھر تھا۔ چونکہ اجمل کی ماں مدت سے نوت ہو چکی تھی۔ اور بہنیں سب اپنے اپنے گھر اور بچوں واپسیں اس لئے فرحت کی خدمت کرنے کے لئے خود بآجرہ کو اجمل کے ہاں جانا پڑا۔

جمل کا گھر ایلی کے گھر کے پاس ہی تھا۔ چوگان کے شمال کی طرف ایک چھتی گلی، جسے گلیارہ کہتے تھے سے گزر کر ایک اندھیری ڈیوڑھی کو پار کر کے اس نئے گھر کی سیڑھیاں آتی تھیں لیکن اس اندھیری ڈیوڑھی کو پار کرنا آسان نہ تھا۔ کیوں کہ وہ پہر کی کڑکتی وہوپ میں بھی اس ڈیوڑھی میں گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا رہتا تھا۔ اس گھر کے ایک طرف ایلی کے ماموں حشمت علی رہتے تھے اور دوسری طرف اس کی خالہ کا

کنبہ آباد تھا۔ یہ تینوں گھر دراصل ایک ہی بڑی حوالی کے حصے تھے جسے کسی زمانے میں آصفی بزرگوں نے تعمیر کیا تھا۔ اگرچہ بارے سے دیکھا جائے تو یہ نیا گھر علیٰ احمد کے مکان سے بُعْد تھا۔ درمیان میں صرف ایک چھت پڑتی تھی۔ اس لئے ایلیٰ عام طور پر پالحقہ کو بُخے سے گزر کر دیوبند کرنے گھر چلا جایا گرتا تھا تاکہ اسے اندر ہیری ڈیورٹی سے گزرنامہ پہنچے۔

اجمل کے والدہ بھی زمانے میں اکلم نیکس کے ففتر میں افسر تھے اب بھی ان کے شے اور انداز سے تھامنا نہ جاہوجلال کے آثار ہو یدا تھے ان کے چہرے پر حکومت اور صحت کی سرخی جھلکتی تھی۔ اگرچہ انہیں عہدہ چھوڑ لئے کئی سال گزر چکے تھے۔ کہا جاتا تھا کہ انہیں ایک طوائف جاگلی سے بُجت تھیں۔ جس کے عشق میں انہوں نے بھی کچھ کھو دیا تھا اور نوکری سے فارغ ہو کر جاگلی کے یہاں جا مقیم ہوئے تھے۔ اجميل کی والدہ بھی عرصہ دراز سے لقدماء جل ہو چکی تھیں۔ اجميل کی تین بہنیں بقید حیات تھیں۔ سیدہ رابعہ اور انور سیدہ نہ جانے کس سے بیا ہی ہوئی تھی۔ مگر دادی کے پاس رہتی تھی۔ رابعہ ایلیٰ کے خالہ زاد بھائی پروین کی بیوی تھی اور انور کی شادی ہمانی سے ہو چکی تھی جو کسی دو دراز مقام پر کسی مدرسے میں اتنا لیق تھے۔ ان حالت میں اجميل کا گھر ویران پڑا تھا۔ اس کے بیاہ اس کے والد آئے۔ بہنیں بھی اکٹھی ہوئیں لیکن جلد ہی وہ سب اپنے اپنے گھر لوٹ گئے اور اجميل کے گھر میں صرف فرحت ہاجرہ اور ایلیٰ رہ گئے تھے۔ اسی لئے ایلیٰ نے محسوس نہ کیا کہ وہ گھر بیگانہ ہے۔ اکثر وہ والدہ کے ساتھ وہ ہیں رہتا۔ رابعہ سے با تین کرتارہ تیار پڑوں میں رفیق کے گھر چلا جاتا اور یادوسری طرف پروین کے والد محسن علی کے پاس جا بیٹھا۔

”آوایلیٰ آوا۔“ محسن اسے دیکھ کر چلاتے۔ ”کہو علیٰ احمد کیسے ہیں۔ کوئی نئی شادی کرنے کی تو نہیں سوش رہے۔“ اور وہ ہٹنے لگتے۔

ایلیٰ کو محسن علی بے حد پسند تھے ان کی باتوں سے سچائی اور خلوص پیکتا تھا۔ بزرگ

ہونے کے باوجود ان میں تصحیح نام کو نہ تھا۔ محسن علی کے مکان سے مخفی دلان میں پہلی مرتبہ اس کی ملاقات شریف سے ہوئی تھی۔

## شریف

شریف ایک پتلاؤ بلا کمزور اور اس شخص تھا جو چپ چاپ چار پالی پر بیٹھ کر حلقہ پینے کا عادی تھا۔ دیوار سے لگائے کمبل اوزھے وہ حق پینے میں مصروف رہتا۔ اس کی آنکھیں نہ جانے کہاں لگی رہتی تھیں جیسے ہمیں لگی ہوں اور وہ خلا کو حسرت بھیر نگاہوں سے گھوڑتا رہتا۔ پچھلے دیوبنے کے بعد ایک موہوم سی آہ بھر کر ایک نگاہ غلط نداز سے گرد و پیش کی طرف دیکھتا اور پھر اپنی نیائے خیال میں لوٹ جاتا۔ اس کا سر دیوار پر تک جاتا اور نگاہ ہیں اسی طرح خلا کو گھوڑتے لگاتیں۔

”آوایلی۔“ شریف نے اسے سرسری طور پر بلایا۔ ”بیٹھ جاؤ۔“ ایک نظر اس نے ایلی کی طرف دیکھا اس کی نگاہ میں عجیب سی شمک تھی جو ان کی آن میں لہرا کر فائن ہو جاتی تھی۔ اس ایک ہی چمک میں سب کچھ تھا۔ خلوص، محبت، سادگی۔ ناکامی وہ چمک کبھی کبھی عیاں ہوتی تھی جیسے ابر آلود رات کو کبھی کبھار چاند ایک ساعت کے لئے مسکرا کر منہ چھپا لیتا ہے۔

وہ ایک چمک نہ جانے ایلی سے کیا کہہ گئی۔ جیسے ہمیشہ کے لئے محبت کا پیان کر گئی۔ ایلی بیٹھ گیا۔ شریف بیگانہ ہونے کے باوجود بیگانہ محسوس نہ ہوتا تھا۔ ایسے محسوس ہو رہا تھا اسے جیسے وہ شریف سے مددوں سے واقف ہو۔ جیسے وہ دلوں پر اُنے دوست ہوں۔

”اے ایلی۔“ شریف نے آہ بھری ”کیا وہ ڈائیں ابھی تک جیتی ہے بتا۔“ اس کے ہونٹوں پر زہر خند تھا۔

”ڈائیں“ ایلی نے حیرانی سے دہرایا ”ہاں وہ بڑھیا۔ تمہاری دادی۔“ شریف نے کہا۔ ایلی کو یہ بات سخت ناگوار گز ری۔

”کیا وہ ڈائنس بھی نہ مرے گی۔ کیا وہ اسی طرح دوسروں کی زندگی تباہ کرتی رہے گی۔“

شریف کے چہرے سے حسرت و بر بادی پیشی تھی۔ ایلی کے دل میں شریف کے لئے جذبہ ہمدردی ابھر آیا۔ اس نے ان جانے میں محسوس کیا کہ شریف مظلوم تھا۔ اس پر ظلم توڑے گئے تھے۔

نہ جانے لوگ دادی اماں کو داں کیوں کہا کرتے تھے نہ جانے صدر اس کے سینے میں پٹا خے کیوں پھینکا لگتا تھا اور محلے کے تمام بڑے اس سے خالق کیوں تھے۔ یہ تو ایک حقیقت تھی کہ وہ بچان کا شور سن کر گھرگی میں آبیٹھتی اور انہیں جھاڑ جھپاڑ کیا کرتی تھی۔ لیکن صرف اسی بات پر سے داں لہنا تو روانہ تھا وہ اس کے کردار کے دوسرے پہلو سے کیوں واقف نہ تھے۔ انہیں اس کی بناؤں تیوری کے نیچے دلی دلی مسکراہٹ کیوں نہ دکھائی دیتی تھی۔ ایلی کے کے لئے وہ بوڑھی ڈائنس گھر کے پھیلے ہوئے صحراء میں واحد نخلستان تھی۔ محبت کا چھوٹا سا ڈھکا چھپا چشمہ جو شور مچا کر اپنے وجود کے اعلان کرنے کا دادی نہ تھا بلکہ چپ چاپ بے آواز بھے جاتا تھا۔

”نبیم۔ نبیم۔ وہ نبیم مرے گی۔“ شریف نے یاس بھری نگاہ ایلی پر دالی۔ ”بھی اسے نہ جانے کن کن کے درمیان دیوار بنانا ہے۔“ شریف کی باتوں سے ظاہر تھا جیسے شریف کی زندگی تباہ کرنے میں صرف دادی اماں کا ہاتھ ہو مگر اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ شریف کی زندگی کس اعتبار سے بر باد ہو چکی تھی اس نے صرف یہ محسوس کیا کہ شریف اس چینی کی پیالی کی مانند تھا، جس میں بال آچکا ہو۔

پہلی ہی نشست میں ایلی شریف کا دوست بن گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ شریف کا راز داں ہے اگر چاہے شریف کے راز کے متعلق کچھ معلوم نہ تھا۔

شریف سعیدہ کا دیور تھا اور جب کبھی علی پور آتا تو وہ سعیدہ کے یہاں ٹھہرتا کھیل و تفریح کی اس محفل میں جو اکثر سعیدہ کے یہاں لگتی تھی۔ شریف کی موجودگی عجیب سی

لگتی جیسے طربیہ راگ میں بے بر جت سر لگا ہو۔ ایک بات بہر طور واضح تھی کہ شریف عشق کامرا ہوا تھا۔ ایلی کو عشق کے مفہوم سے پورے طور پر واقفیت نہ تھی۔ عشق بھی عجیب چیز ہے۔ ایلی سوچتا جو شریف کی آنکھوں سے حزن و ملاں بن کر جھلکتا ہے۔ صدر کی آنکھوں نے رنگ کے چینے بن کر اڑاتا ہے۔ اور احمد کی آنکھوں میں شرارت بن کر کوئندتا ہے۔ آخر یہ چیز کیا ہے؟

پھر احاطے کی بند کھڑکی سے دادی اماں کی آواز گوئی۔ ”ایے ہے آج تم نے یہ کیا محفل لگا کر ہی ہے۔“ اور شریف سر داہ بھر کر کہتا ”وہ گدھ بولی۔ چلا رہی ہے۔ اسے زندگی بھری آوازیں اچھی نہیں لاتیں اسے ویرانہ پہنچ ہے۔“ اس پر ہاجرہ خود کھڑکی کھول کر کہتی ”سعیدہ نے آن مولو شریف کروایا ہے۔“ یہ نہ کرو دادی اماں بڑھاتی ہوئی چلی جاتی۔ پھر سب کے اصرار پر سعیدہ نوپی پہن لیتی اور گانے لگتی۔ مدینے میں سورے سیاں بالا ہے رہے۔ نہ جانے اس تم نے یہ بول کہاں سے سن رکھتے۔ ایلی کو اس کا گانا بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ چپ چاپ بیٹھ کر بغور سننے میں منہمک رہتا مگر با ربار اس کی توجہ شریف کی طرف منعطف ہو جاتی جو چار پائی پر بیٹھا حقہ تھا مے بار بار آہیں بھرتا کرو ٹھیں بدلتا اور محروم نگاہوں سے چھت کی طرف دیکھتے جاتا۔

## بکھری ہوئی کہانی

نئے گھر میں آنے سے ایلی کا دائرة ملاقات و سعی ہو گیا تھا اس لحاظ سے وہ نیا گھر اس کے لئے باعث فرحت ثابت ہوا تھا۔ وہاں اسے بہت سے لوگوں سے ملنے کے معاوق میسر آتے رہتے تھے۔ سعیدہ اور شریف سے تو وہ روز ہی ملتا تھا۔ اسے شریف کے متعلق عجیب و غریب تفصیلات کا علم ہوتا جا رہا تھا۔ اکھڑے اکھڑے واقعات بکھری بکھری تفصیلات۔ محلے کی عورتیں بھی تو شریف کے متعلق دلبی دلبی پھر بھی کبھی کبھار کوئی نہ کوئی بات منہ سے نکل ہی جاتی۔ سانپ تو گزر چکا تھا لیکن لیکر

ابھی باقی تھی اور محلہ والیوں کو سانپ کی نسبت لکیر سے زیادہ دچپتی تھی۔ جب ایسی کسی کے منہ سے شریف کے متعلق کوئی بات سنتا تو اس کے کان کھڑے ہو جاتے اور وہ اس بات کو احتیاط سے اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا کرتا اور پھر جب وہ رات کے وقت بستر پر لیدتا تو سنی ہوئی باتوں کے لکڑے جوائن میں صروف ہو جاتا۔

سعیدہ آہ بھر کر بولی ”شریف نے تو جان بو جھ کر اپنی زندگی تباہ کر رکھی ہے۔ جوانی کو روگ لگا رکھا ہے۔ ایسا بھی کیا کہ کوئی اپنا آپ تباہ کرے۔ لوخالہ بھلا اس بڑھیا سے تو قع کی جا ملکتی تھی کہ وہ ہماری تکین کا احساس کرے وہ تو پلکہ ہماری بر بادی میں خوش ہے۔ اسے تو موقع پا تھا آیا تھا اور اب کان پھڑوا کر میاں رانجھا بنا بیٹھا ہے۔ ہر وقت اپنی ہیر کے خیال میں غرق رہتا ہے اور ہر ہیرے ہیر کو کب سے لے بھی سکتے ہیں۔ لیکن اس نے اپنی زندگی تباہ کر رکھی ہے۔ اسے کون سمجھائے۔“  
رابعہ بولی ”ویسے نام کا شریف ہے لیکن کروت دیکھو۔ خواہ مخواہ اس بھولی بھالی لڑکی کو بھر مالیا۔ اس بیچاری موصوم کو کیا پتہ تھا کہ یہ چال صرف اسے بد نام کرنے کے لئے چلی جا رہی ہے۔ بیچاری کو کیا پتہ تھا کہ اس کے ماتھے پر لگنگ کا یہ لگانے کے لئے یہ کھیل کھیلا جا رہا ہے تو پہ ہے ہم تو کسی کو مند کھانے کے قابل نہ رہے۔ وہ تو دادی اماں نے بچالیا اور نہ جانے کیا ہوتا۔“

چچی کہنے لگی۔ ”بہن آہستہ بات کر۔ یہاں تو عشق لگا ہوا ہے۔ اس شریفے کو دیکھا ہے نے یہ تو پا گل ہو رہا ہے اس کے عشق میں۔ اس لڑکی نے پا گل کر دیا ہے سامنے کھڑی ہو ہو کے۔ دیوانی ہو رہی تھی وہ تو نہ کسی کی شرم نہ لحاظ اور اب اب یہ لڑکا کسی کو گھر سائے گا کیا اونہوں تو پہ ہے بہن دیکھ لوا پنی بیوی کو رلا رلا کے مادیا۔ بیچاری کی خبر تک نہ پوچھی۔ اب اسے کون دے گا اپنی لڑکی۔ اسے تو انوری کی دھن لگی ہے۔ سارا دن آہیں بھرتا رہتا ہے اور آنکھیں موند کر پڑا رہتا ہے اسے تو انوری کھا گئی اے ہے۔ کیا جوان نکلا تھا۔ پر اب تو دیکھا ہی ہے نا تو نے۔“

دادی اماں نے ایلی کو پاس بٹھالیا ”اے ہے ایلی اب تو ادھر آتا گئیں ایسا ہی جی لگ گیا ہے تیرا اس گھر میں۔ اللہ رکھے یہ تیرا اپنا گھر ہے۔ لوگ اپنے ہی گھر میں رہتے اچھے لگتے ہیں۔ ایلی تو ادھرنہ جایا کر۔ شریف کی بری صحبت میں نہ بیٹھا کر سنا تو نے۔ چھوڑ اس کلمو ہے کو مررتا بھی نہیں وہ تو ہمارا دشمن ہے۔ دشمن نے ہماری عزت کو تباہ کر کے رکھ دیا۔“

شریف نے آہ بھر کر کہا ”لا ہور جاؤ گے ایلی۔“ اس نے چھت کی طرف دیکھ کر ایک لمبی آہ بھری۔ ”اس شہر میں رہو گے تم۔ جہاں وہ رہتی ہے۔ آہ۔ اس کے قریب رہو گے۔ اس سے ملنے یا جا کرو گے کتنے خوش نصیب ہو تو۔ انہوں نے اسے زبردستہ ہمدانی سے بیاہ دیا۔ زبردستی اسے ڈولی میں ڈال دیا۔ روئی چینی چلانی ہوئی کو ڈولی میں ڈال دیا ایلی ان ڈائنوں سے اسے جنتے جی مار دیا۔ لیکن پھر بھی وہ میری ہے اس کی منور روشنی میرے لئے ہی مخصوص ہے۔ کتنی وفا ہے اس میں، کتنی پاکیزگی ہے۔ تم وہاں رہو گے جہاں وہ رہتی ہے۔ کتنے خوش نصیب ہو تم۔“ اس نے لمبی آہ بھری اور آنکھیں موند لیں۔

محلے میں شریف کی داستان کے گلوے جا بجا بکھرے تھے اور ایلی انہیں جوڑنے میں مصروف تھا۔ نہ جانے انوری کون تھا۔ جس سے شریف کو عشق تھا نہ جانے وہ حسینہ کون تھی۔ جس نے خاندانی کے نگ و ناموس کو تباہ کر دیا تھا۔ بہر حال اسی شریف سے ہمدردی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ شریف اسے اپنا قصہ سنائے مگر شریف کے سامنے اس خواہش کا اظہار کرنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ بہر حال شریف کی آنکھوں کی چمک اور اس کا دکھی انداز زماں سے بے حد پیارے معلوم ہوتے تھے۔

ظاہر تھا کہ شریف اپنے گزشتہ ناکام عشق کی محرومی میں ابھی تک ڈوبا ہوا تھا اس نے شادی بھی کی تھی مگر اس کی بیوی شریف کے گھر کے ویرانے میں رہ کر تپ دق کا شکار ہو کر مر گئی تھی یہ کوائف تو ایلی کو معلوم تھے۔ مگر ان جزئیات سے کیا ہوتا ہے اسے

تو کل سے دلچسپی تھی۔

یو وقت حق کی تلی منہ میں دبائے شریف دیوار سے لیک لگائے چھت کو گھورتا رہتا اور ساتھ ساتھ موہوم آہیں بھرتا اس کی آنکھیں ایک عجیب و غریب خمار سے چھکلتیں اور اس کے منہ سے رال گرتی رہتی۔ آہیں بیٹھ جاؤ۔ وہ ایلی کی طرف دیکھ کر اسی محروم انداز سے کہتا اور پھر ایلی کی موجودگی سے بے نیاز ہو کر اسی طرح دیوار سے لیک لگا کر چھت کی طرف گلکلی باندھ کر دیکھنے میں کھو جاتا۔ ایلی بیٹھے بیٹھے کسی نامعلوم جذبہ کی شدت سے بھیگ جاتا۔ وہ محسوس کرتا جیسے وہ کمرہ شریف کے خاص سے بھرا ہوا ہو۔ جیسے مرے کی دیوار میں احسان الترام سے ہٹری ہو گئی ہوں۔ جیسے کھڑکیاں منہ کھولے جیریے اس کی طرف دیکھ رہی ہوں۔

شریف کی آمد سے ایلی کو انگرایندگی ناباؤں سے خاس دلچسپی نہ رہی تھی وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ زندگی کی سب سے بڑی عظمت عشق ہے۔ پاکیزہ عشق محروم عشق اور چلتی لڑکیوں کو دیکھنا تو بچوں کا کھیل ہے۔ اگر چہ اسے معلوم نہ تھا کہ عشق کا مطلب کیا ہے۔ مرد عورت سے کیا محبت کرتا ہے مگر نہ جانے کیسے اب وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ عشق سے بڑھ کر اور کوئی چیز قابل حصول نہیں۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ وہ کس سے عشق کرے۔ کیسے عشق کرے لیکن ان دونوں اس کی سب سے بڑی تمنا سمجھتھی کہ وہ کسی سے عشق شروع کر دے اور پھر ناکام ہو کر شریف کی سی جاذبیت پیدا کر لے اور دیوار سے لیک لگا کر چھت کو گھونز نے میں زندگی سرف کر دے۔ اسے شریف کی زندگی کا یہ پہلو بے حد پیار الگتا تھا لیکن اس سے ہٹ کر شریف کی باقی ماندہ شخصیت سے اسے گھن آتی تھی۔ مثلاً شریف کا ڈھیلا ڈھالا پن۔ اس کی چال ڈھال اسے قطع پسند نہ تھے اور اس کے منہ سے رال سی ٹپکتی دیکھ کر تو وہ کراہت سے منہ موڑ لیتا تھا۔ اس کے لئے شریف کی تین خصوصیات بے حد پیاری تھیں۔ شریف کی محبت بھری نگاہیں، غمناک نگاہیں جن میں ایک مٹھاں اور محرومیت بھرانشہ روائیں

دوں رہتا تھا۔ شریف کے بے پناہ خلوص اور شریف کی دوست نوازی

حاجی شریف کی رخصت ختم ہو گئی اور وہ واپس اپنی نوکری پر چلا گیا۔ شریف کے جانے کے بعد ایلی کئی ایک دن اکھڑا اکھڑا رہا۔ ارجمند کے اسرار کے باوجود کیپ اور کپ کی طرف متوجہ ہوا۔ انہیں اس لئے انگریزی ماباؤں کے کھیل میں حصہ لیا۔ اسے صرف ایک دہن لگی تھی کہ وہ کسی سے باقاعدہ عشق کرنے کسی سے عہد و پیمان کرے اور پھر اسے نبھانے کے لئے زندگی وقف کر دے لیکن کوئی بھی تو نہ تھی جو اس سے عہد و پیمان کرنے پا مائل نظر آتی ہو کوئی اسے خاطر میں نہ لاتی تھی۔ بڑی عورتیں اسے قابلِ انتقام و سمجھتی تھیں اور چھوٹی لڑکیوں میں اسے خود کوئی لچکی نہ تھی۔

بہر حال کچھ دری کے بعد ہی شریف کا وہ اثر معدوم ہو گیا اور ایلی پھر سے ارجمند کے ساتھ کھیل میں حصہ لینے لگا۔ لیکن یہ شمولیت محض ایک فریب تھا ایک دکھاو اتحا دراصل ایلی کی عشق کرنے کی خواہش سمٹ کر اس کے دل کی گہرائیوں میں بیٹھ گئی تھی۔

## میری کلیویشن

پھر دویں کے امتحانات قریب آگئے اور ایلی کی توجہ اس طرف مبذول ہو گئی اور وہ پھر بام آباد کیلئے حازم سفر ہو گئے۔ بام آباد پہنچ کر آہستہ شریف اس کے ذہن سے خارج ہو گیا۔ با آباد میں اب وہ اکیلے نہ تھے۔ ان کے ساتھ شیم کھی۔ اس کے حنا مالیدہ ہاتھ۔ فیروزی چاور اور چٹے سفید چوڑے چہرے سے سارا گھر بھرا ہوا تھا کبھی کبھار اس کے حنا مالیدہ ہاتھوں کو دیکھ کر ایلی محسوس کرتا جیسے صفیہ پھر سے جی انھی ہو۔ اس خیال پر وہ تڑپ کر انھوں نے بیٹھا۔ شیم کے خوابیدہ چہرے کو دیکھ کر۔ اس کی نیم مردہ آنکھوں کو دیکھ کر جن میں عجیب سی بے ربطی تھی، ایلی مایوس ہو جاتا۔ ”نہیں یہ صفیہ تو نہیں۔ اس میں وہ بات ہی نہیں۔“ اس احساس کو شدت سے محسوس کر کے ایلی کی

نگاہ میں شیم کے ہاتھوں کارنگ اڑ جاتا اور اسے محسوس ہوتا جیسے وہ ہاتھ سفید نہیں بلکہ پپیلے ہیں اور وہ پپیلا پن رنگ کی وجہ سے نہیں بلکہ بے جان ہونے کی وجہ سے ہے۔ اس کے بعد اس کیلئے گھر میں رہنا مشکل ہو جاتا اور وہ باہر گھنٹام اور ایشور لال کی طرف نکل جاتا اور پڑھنے کے نہیں ان دونوں کو دیکھ دیکھ کر آہیں بھرتا رہتا اور یہ محسوس کرنے کی کوشش کرتا کہ اسے ان سے عشق ہے، عشق چیز را۔ دن وہ ایشور لال یا گھنٹام کے پاس گزارتا اور پھر شام کو کتابیں اٹھا کر گھر کی طرف چل پڑتا۔

گھر کے قریب پہنچتے ہیں وہ رک جاتا۔ کہیں علی احمد نہ دیکھ لیں کہیں وہ نہ پوچھ لیں کہ تم نے آج کیا پڑھا، علی احمد کا ذرا اس سے دل پر بوجھ بن جاتا حالانکہ گھر میں علی احمد نے اسے بھی کچھ نہ کیا تھا۔ بھی چشم ہر نے کلیخ اسے بلا تے یا بازار سے سودالانا ہوتا اسے آواز دیتے اور یا بھی مہربا ہوتے تو دو تلوں الگیوں میں گوشت کا کلڑایا کوئی اور کھانے کی چیز پکڑ کر چلاتے "ایلی یہ لے ایلی۔" اس کے علاوہ بھی ایلی کی بھی نہ ہوئی تھی اور نہ ہی انہوں نے محسوس کیا تھا کہ وہاں کے قریب چند ایک گز کے فاصلے پر ایک لڑکا ایلی بھی رہتا تھا۔

شیم کے آنے کے بعد چند ایک دن کے لئے تو علی احمد کے کمرے میں شیم شیم کی آوازیں گوئی رہیں اور شیم کی آواز مدھم سر گوشیاں کرتی رہی۔ پھر وہ سر گوشیاں معلوم ہوتی گئیں اور بالآخر ایلی کو اس کمرے سے سسکیاں سنائی دینے لگیں اور شیم کا انداز محرومیت کا غمار ہوتا گیا۔ اس کی آنکھوں کی چمک ماند پڑتی گئی اور علی احمد کی کھنکھار میں درشتی کا انداز واضح ہوتا گیا۔ جلد ہی کور پھر سے آموجود ہوئی اور بند کمرے کے پیچھے اس کے دانت چمکنے لگے۔ "بایو جی کے مزاج ٹھیک ہونے والے ہیں۔ وہ سنگھے کی رسی گھما کر کھتی اور شیم باور پی خانے میں حیران نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھتی جیسے کہیں کھو گئی ہو۔ جیسے اس کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ کیا ہو رہا ہے۔ اس پر دوسرے کمرے میں ہاجرہ کے ساتھ بیٹھی ہوئی رفیقان مسکراتی اور اپنا بدن سیکھ کر

ہاجرہ سے کہتی ”ہائے اب کیا ہو گا۔“ اور ایلی غصے سے کھولتا اور اس کا جی چاہتا کہ چلا کر کہے ”اب میں دسویں جماعت میں ہوں۔ اب میں بڑا ہو گیا ہوں۔ اب میں دیکھوں گا کہ یہاں کون آتی ہے۔“

”ایلی کور کے لئے پانی لاو۔ ایلی، علی احمد کی کھنکھار سن کر اس پر سکتے کا عالم چھا جاتا۔ جسم پر سویاں تی جلنے لآتیں اور وہ اٹھ کر کھڑا ہو جاتا۔“ ”آیا جی۔“ اس وقت وہ یہ حقیقت بھول جاتا کہ وہ دسویں میں ہے اور گھر میں خورتوں کا آنا جانا برداشت نہیں کر سکتا اور ہبوباتیں اٹھا کر باہر نکل جاتا۔

کنوئیں کے پاس پیش کر اس کے حواس درست ہوتے۔ وہندہ لکا دور ہو جاتا اور شیم حنا مالیدہ ہاتھ فضا میں لٹکتے دھانی دیتے اور اس کی آنکھوں کا فرق اس قدر نمایاں ہو جاتا کہ وہ چونکہ پڑتا اور محسوسی کرتا۔ جیسے وہ ایلی کی مدد مانگ رہی ہو۔ جیسے وہ ایلی کی پناہ لے رہی ہو۔ اس خیال پر وہ کنوئیں پر بوتل رکھ کر سیدھا کھڑا ہو جاتا۔ ”میں دسویں جماعت میں ہوں۔ میں اب بچنہیں دیکھوں گا اس گھر کون کون ناپاک کرتا ہے۔“ پاؤں کی ٹھوکر سے وہ بوتل کو گرا دیتا جو کنوئیں کی مندیر پر لڑھک لڑھک کر نیچے جا گرتی ”مجھے دیبوں پاس کرنا ہے۔ مجھے ضرور دسویں پاس کرنا چاہئے۔ ورنہ یہ گھر بھی پاک صاف نہ ہو سکے گا۔ مجھے دسویں پاس کرنا ہی ہو گا۔“

اگر ایلی کو گھر کی ناپاکی کا خیال نہ ہوتا اگر شیم کے حنا مالیدہ ہاتھ اس کے سامنے فضا میں محرومیت سے نہ لٹکتے اگر کور کے سفید دانتوں سے اسے شدید نفرت نہ ہوتی تو شاید ایلی کبھی دسویں پاس کرنے میں کامیاب نہ ہوتا۔ سکول میں وہ ایک نالائق لڑکا تھا نہ تو اسے پڑھنے کا شق تھا نہ وہ ذہین تھا جماعت کے لڑکے اس کی باتوں پر بہسا کرتے تھے اور استاد اس کی نالائق پر تحقیق ہے لگایا کرتے تھے۔

جوں جوں امتحان قریب آتا گیا، شیم کی نگاہیں اور بھی محروم ہوتی گئیں۔ کور کے دانت اور بھی چمکیلے ہوتے گئے۔ علی احمد کی کھنکھار میں اور بھی درشتی پیدا ہوتی گئی اور

ایلی کا عزم اور بھی تقویت حاصل کرتا گیا۔ اب وہ رات کو چپکے سے کتاب لے کر بیٹھ جاتا اور چور چورے اسے یاد کرتا رہتا۔ علی احمد کی الماری میں بہت سی کتابیں تھیں۔ گرائمر، یونیک، پریپوزیشنز، ہر چیز پر علیحدہ کتاب تھی اور وہ باری باری انہیں الماری میں سے لکھاتا اور چوری چوری پڑھتا۔

اس کے باوجود وہ اختا کا نتیجہ سن کر حیران رہ گیا اسے یقین نہ آتا تھا کہ وہ پاس ہو چکا ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ اس نے پر پچھی تو اچھے نہ کئے تھے لیکن زیادہ تعجب کن بات یہ تھی کہ دویں جماعت پاس کرنے کے باوجود وہ وہی ایلی تھا۔ جیسے پہلے تھا۔ اس میں ذرا بھی تفریق نہ آیا تھا کوئی تبدیلی نہ ہوئی تھی۔ علی احمد کی حکماہار سن کر اس کا حلق و یہے ہی سوکھ جاتا تھا اور تم پرویزے ہی چیزوں کی رہنمائی تھیں اور جی ہاں کہہ کروہ اسی طرح بول اٹھا کر کنوں میں فی طرف چل پڑتا تھا۔ اس کی آنکھوں تلنے شیم کے حنا مالیدہ ہاتھ اسی برح بے بسی سے لکھتے تھے۔ اس کے سوا وہ کیا کر سکتا تھا کہ کور کی بولی کوٹھو کر کر گرادے اور کور کی بولی میں ٹھوک دے۔

دویں پاس کرنے کے بعد وہ علی پور آگیا اور پھر دادماں کے پاس رہنے لگا۔ دادی اماں کے پاس رہنے میں کس قدر آرام تھا۔ اسے نماز پڑھتے اور تسبیح کے والے پھیرتے دیکھ کر اس کے دل میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی۔ دادی اماں کا گھر کس قدر پا کیزہ تھا۔

دادی اماں کے گھر کی پا کیزگی پر مسرور ہونے کے باوجود وہ ارجمند سے انگرایعندی ملباوں میں مصروف ہو جاتا اور جب وہ کنوں میں کے پاس جا کر ریشمی رو مال ہلاتے اور بانسری بجا تے تو کیپ کی کھڑکی کیجھ ق میں ہلکی سی لرزش پیدا ہو جاتی۔ ایک آنکھ ابھرتی مگر ایلی کونہ جانے کیوں کیپ سے چند اس دلچسپی نہ تھی۔ اس کے ذہن میں تو حتمی ہاتھ رقصان تھے۔ اگر چہ حنا کارنگ دیکھ کر اور اس کی بوسوں کر کے اس کی طبیعت ماش کرنے لگتی تھی اور جسم کا بند بند لرز جاتا تھا۔ پھر نہ جانے کیوں اس کے

ون میں حتایقی ہاتھ لڑ کتے تھے۔ اس کی جانب بڑھتے۔ وہ گھبرا کر سمتا اور پھر ایک جھر جھری اسے جھوٹی ایک ہواںی سی چل جاتی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایسا کیوں ہوتا ہمیکیوں۔ اس کا دل چور چوری خواہش کرتا کہ وہ ہاتھ سے تھپک تھپک تھپک کر سلا دیں اور ایک بھرا ہوا جسم اس پر جھک جائے۔

اس کا جی چاہتا تھا کہ گیپ کی بجائے کوئی بڑے سے جسم اور گدے جیسے گول گول نکلیں ہاتھوں والی اس چیز کے پیچے کھڑی ہو اور وہ محسوس کرے کہ ایسی اس کی طرف دیکھ رہا ہے لیکن بھرے جسم والیاں تو اسے خاطر ہی میں نہ لاتی تھیں نہ جانے کیا سوچتی رہتی تھیں وہ ایسی۔ چوری چوری ان کی طرف دیکھتا اور پھر گھبرا کر ان کے ہاتھوں کی طرف دیکھتا اور بالآخر ان کے پاؤں کو گھورتا لیکن انہیں احساس ہی نہ ہوتا کہ کوئی دیکھ رہا ہے کن نظر وہ سے دیکھ رہا ہے انہیں کام کا ج سے اتنی فرصت ہی نہ ہوتی کہ ایسی کی نگاہوں یا اس کی موجودگی کو محسوس کریں۔ ایسی چاہتا تھا کہ وہ اس کی موجودگی کو محسوس کریں۔ ایسی چاہتا تھا کہ وہ اس کی نگاہوں کو محسوس کر کے لے جائیں۔ اپنی آپ سمجھیں۔

## ہاکی سٹک

اسے چپ دیکھ کر دادی اماں چلائی۔ ”ایسی کیا ہے تجھے یوں گم سم بیٹھ رہتا ہے تو نہ جانے کیا ہو گیا ہے تجھے یا تو سارا دن اللہ مارے لڑکوں کے ساتھ لگا رہتا ہے یا گھر میں آکر یوں گم سم بیٹھ رہتا ہے۔“ ایسی یہ سن کر دادی اماں سے لپٹ جاتا۔ انہیں دیکھ کر سر گھٹنوں میں دے کر مسکراتی اور دادی اماں چیختی۔ ”ات ہے اب تجھ سے لڑائی کوں لڑے تو ہے۔۔۔ کتنا بڑا ہو گیا ہے تو۔۔۔ ابھی کل اتنا سا تھا اور آج دیکھو۔۔۔ شرم تو نہیں آتی۔ تجھے بوڑھی جان کی ہڈیاں توڑتے ہوئے۔

جا۔۔۔ کھیل جا کے اس سے تو کھیلنا ہی اچھا۔“

دادی اماں کو چھوڑ کر وہ سیدھا رضا کی دوکان پر جا پہنچا۔ اب رضا اس کا دوست

بن چکا تھا۔ رضا کی دوکان محلے کے اوپر بazar میں تھی میلے سے دروازوں کے پاس دھنڈلی دیواروں کے درمیان کئی ایک گتے کے ڈبے رکھے ہوئے تھے جب میں مختلف اشیاء پڑی تھیں۔ ایک میں ربوڑ کے گیند تھے، ایک میں بچوں کے چو سنے کی مٹھائی۔ ایک میں لڑکیوں کے بالوں کے لئے بنیں اور کلپ تھے۔ دو ایک گتوں پر چمکدار بٹن لگے ہوئے تھے ایک گتے پر لو ہے کی چیزوں نیاں پہنچی ہوئی تھیں۔ ایک کونے میں مٹی اور ربوڑ کے چند لکھوں نے رکھے ہوئے تھے۔ ان ٹبوں کے پاس رضا بوریئے پر بیٹھا رہتا تھا۔ جس کے قریب ہی اس کا پکڑ کر چلنے والا سوٹا پڑا ہوتا تھا اور سونٹے کے پاس اس کا مٹھائی خیز جوتا۔ ان جوتے کو دیکھ کر خواہ مخواہ فہمی آ جاتی کیونکہ اس کا ایک پاؤں تو عام جوتے کے ساتھ کا تاطاو اور دوسرا ثیڑھا اور بچکا نہ۔ رضا کی نامگوں کو دیکھ کر ایک ساعت تھے لئے ہر نوادر چونکتا۔ اسے محسوس ہوتا جیسے اپنی ناگ کے پاس اس نے لکڑی کی ایک مری ہوئی کھوٹی ڈال رکھی ہو۔ لوگوں کو اپنی ناگ کی طرف گھورتے ہوئے دیکھ کر وہ چلاتا۔ ”میری طرف دیکھتے بايو جی۔ میری برف۔ یہ کھوٹی بکاؤ نہیں۔“ اور پھر منہ پکا کر لیتا یا نہ کہتا۔ پسند ہے یہ تو ایک تم کو بھی دلا دوں۔ ”رضا اپنی لکڑی ناگ پر شرمندگی محسوس کرنے کے بجائے خیر محسوس کرتا تھا“ یار، وہ دوستوں کے درمیان کھونٹے کے سہارے کھڑا ہو کر لکڑی ناگ کو گھما کر کہتا ”اللہ میاں نے مجھے تو ایک ہاکی دے رکھی ہے کیا سمجھا ہے تم نے اسے کسی سے لڑتے وقت رضا کو اپنے حریف کو پچھاڑتے ہوئے دیکھ کر ایسی محسوس کرتا جیسے لکڑا ہونا خصوصی نعمت ہو۔ رضایوں حریف سے چھٹ جاتا۔ جیسے جزیرے کا بلڈھا پیر تسمہ پا ہو اور پھر اس مری ہوئی کھوٹی سے واقعی یوں کام لیتا گویا وہ ہاکی سٹک ہو۔

لیکن رضا طبعاً لڑنے سے گرین کرتا تھا ہر بات کو مذاق میں اڑا دینے کی قابلیت گویا اس نے ورنہ میں پائی تھی اور پھر اس کی باتیں سن کر محلے کے لڑکے نہیں

ہنس کر پا گل ہو جایا کرتے تھے۔

ایمی رضا کے پاس جاتا تو وہ اٹھ بیٹھتا ”آڈا یلی آؤ۔ میاں بیٹھو، وہ دکان کے اندر ایک بوریاں بچھا دیتا۔“ تاش کھیلیں۔ سیر کرو گے تو چلتے ہیں دکان بند کر کے چلتے ہیں۔ چلو۔“

”غبیس نہیں۔“ ایمی چلاتا ”میں تو ویے اسی آیا تھا بیٹھنے کے لئے۔“

”اچھا تو نہیں ہے۔“ اور وہ دونوں بیٹھ جاتے انہیں پاس بیٹھ کر باقیں کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہ ہوتی تھی۔ چپ چاپ دونوں بیٹھے رہتے اور رضا حسب معمولی ساتھ واے تھیم تباکو فروش اور بڑی فرش پر پھیلیاں کستار ہتا اور ایمی ہفتا رہتا۔ پھر جیل اوہر لکتا۔ 2002-2005 Rights Reserved © Cyber Library

”اے بھائی جیل۔ جیل۔ کہاں جا رہے ہو۔“ رضا چلاتا۔ ”کچھ مٹھائی قند ہے نا آج چلو ہم بھی چلتے ہیں۔ ایمی بھی بیٹھا ہے۔ میاں اندر دکان میں ہے۔“

مٹھائی قند کا نام سن کر جیل غصے سے گھونسر گھاتا۔ ”ملنگرے دوسرا ناگ کی خیریت نہیں چاہئے۔“ جیل اندر را خ ہوتا۔

پھر وہ تاش کی بازی شروع کر دیتے اور دیر تک تاش کھیلتے رہتے۔ حتیٰ کہ کوئی آکر ایمی کو خبردار کر دیتا کہ دادی اماں کھڑکی میں بیٹھی ہر آتے جاتے سے اس کے متعلق اپنے چھوڑا ہی ہے اور محلے کے تمام اڑکوں کو گالیاں دے رہی ہے۔ پھر ایمی چپ چاپ اٹھ کر گھر کی طرف چل پڑتا۔

راستے میں کنوئیں کے قریب یالائیں کے پاس ارجمند اسے دیکھ کر چلاتا۔

”اے یار غصب ہو گیا۔ ایمی آج تو وہ ہمارے گھر آگئی۔ ظالم نے نیلا سوٹ پہن رکھا تھا۔ نیلا سوٹ اور سفید رنگ تو بہے۔“

”میں ذرا گھر جا رہا ہوں۔“ ایمی جواب دیتا۔

”پا گل ہو۔“ ارجمند چلاتا ”آج اور گھروہی بات ہوئی آج ہی گھر میں

بوریانہ ہوا۔ بھی آج خاص دن ہے۔ آج نہیں جاسکتے تم تمہیں پڑھنے نہیں اس کی سیبیلی  
آئی ہوئی ہے۔ وہ دیکھو وہ سمجھان اللہ کیا سیبیلی ہے۔ سمجھت۔ اندر کا اکھاڑا  
بنا ہوا ہے۔ یہ گھر آج آہا۔ وہ دیکھو۔ چاند سامکھڑا انکل آیا۔ ذرا چلت اٹھا کہ میری  
جان۔ منہ وہوئے بغیر کیا پھسن نہ ہے ”جلم مریں تو ری اہیاں۔“

نہ جانے کیوں آپس کرنے لگا تھا کہ ارجمند محض گھریوں کا کھیل کھیل رہا ہے۔  
بے جان گڑیاں جو اجاتیں جھنپتیں ظاہر ہوتیں اور چھپ جاتیں اور پھر کھلکھلا کر فستیں  
اور چلا چلا کر باقیں کرتیں۔ اس وقت ایلی کی نگاہوں تلنے دو بھرے بھرے بازو لکتے  
خڑوٹی بانہوں کی جاذبیت فضل پر چھا جاتی۔ اور بھرے بھرے جسم میں خاموش  
بجلیاں سی روں دوان ہوتیں۔

یوں محلے میں صبح سے شام ہو جاتیا اور رات کو بستر پر پڑے پڑے وہ سوچتا۔ کس  
سے عشق کروں۔ کس سے۔

ایلی کو علی پور میں رہتے ہوئے ابھی کچھ زیادہ عمر صرف نہیں گز را تھا کہ علی احمد آگئے اور آتے ہی بو لے ایلی کا جی میں داخل ہونے کے لئے تیار ہو جاؤ کل ہم جا رہے ہیں۔ ”ایلی کے جسم میں ایک ہوائی سی چھوٹ گئی۔ لاہور وہ لاہور جہاں وہ اپنے ماموں قوم کے ساتھ گیا تھا وہاں پہیسہ اخبار محلے میں جہاں قوم رہتا تھا۔

شام کے وقت جب قوم اسے نانگے میں بٹھا کر سیر کو لے گیا تھا۔ سفید گھوڑی والا نانگہ جس کا کوچوان بیوڑا ہاں ہونے کے باوجود اس قدر زندہ دل تھا ”موتی“ بیٹی۔ آج بابو جی کو سیل کرانا ہے ۔ چل بیٹی دوہن کی چال چلو۔ چل۔ ” اور موتی یوں چلنے لگی تھی جیسے اس کی نانگوں نے چھوٹے چھوٹے پیسے لگے ہوئے ہوں۔ گردان کے بال لہرا رہے تھے۔ نیچے سڑک پانی کے دھارے کی طرح بہہ رہی تھی اور یہ دھارا چوڑا ہوتا جا رہا تھا اور چوڑا۔ اور چوڑا۔ سڑک دونوں کناروں پر سربز درخت اور اوپری عمارتیں ناق رہی تھیں۔

پھر مکانات اور عمارتیں کم ہوتے گے۔ ان کی جگہ دونوں طرف گھاس کے بزر قطعے پھیل گئے جن میں سے رنگ کے پھول سراٹھا اٹھا کر دیکھنے لگے۔ سربز درخت جھوم رہے تھے خاکستری ٹیلے لڑک رہے تھے۔ سڑک بھورے فیتے کی طرح چل رہی تھی۔ بزر خمیدہ کھبوں پر بتیاں یوں ٹمٹما ریہ تھیں جیسے جگنوں چمک رہے ہوں ۔

لاہور کا نام سنتے ہی وہ اٹھ بھاگ۔ ” دادی اماں میری قیص کہاں ہے دادی اماں میرا جوتا ” ” دادی اماں پوچھ رہی تھیں۔ ” لڑکے میٹھی روٹیاں پکا دوں تھے۔ ساتھ لے جانا رہے گاڑی میں بھوک لگے گی تو کیا کرے گا۔ ”

چند ایک گھنٹوں میں ایلی کی تیاری مکمل ہو چکی تھی۔ اس کے پاس تھا ہی کیا کہ سنجا

لئے میں دیر لگتی۔ دو قیص چار ایک پا جامے ایک پر ان کوٹ اور ایک گھسا ہوا جوتا۔

لاہور پہنچ کر علی احمد نے اسے تانگے پر بٹھایا وہ تانگہ انہیں گندے اور بھیڑ سے بھرے بازاروں میں سے گھماتا ہوا بھائی دروازے لے گیا۔ یہ کیسا لاہور تھا۔ کیا یہ وہی لاہور تھا۔ جہاں موتی نے اسے سیر کرائی تھی۔ یہ لاہور اس لاہور سے کس قدر مختلف تھا۔

ایلی کی سمجھ میں نہ آیا پھر بھی اسے تسلی تھی کہ وہ لاہور پہنچا ہے اب اسے گھر میں دبک کر رہنے کی کوئی وقت سے نجات مل جائے گی۔ اب اس سے کوئی نہ کہے گا ”ایلی حقہ بھر دو۔“ اب اسے کنوئیں سے بوتل میں پانی بھرتا نہیں پڑے گا اور علی احمد کا کمرہ دور ہو گا۔ بہت دوسرے اب کوئی آہما صحن میں بیٹھ کر تنگے سے زمین پر لکھنے میں مصروف دکھانی نے دے گا اور نیم دا دروازے سے رضامندی بھرے سفید دانت نہ چمکیں گے۔ اب اسے ہر چیز خریدنے کے لئے علی احمد کے سامنے ہاتھ پھیلانے نہ پڑیں گے۔ جب وہ علی احمد سے پیسے مانگتا تھا تو تو بہے وہ ایک جملہ کتنا دو بھر ہو جاتا تھا اور اور جب کچھ کہہ چلتا تو علی احمد کے جواب دینے سے پہلے دنیا پر سنا نا چھایا رہتا۔ زندگی گویا جنم کو برف کی سل بن جاتی اور پھر جب علی احمد اچھا کہتے تو گویا ”کن،“ کی آواز آتی اور وہ اجما دا اور تعطل ختم ہو جاتا اور چاروں طرف زندگی از سر نوبیدار ہو جاتی۔ لیکن علی احمد اچھا کہتے تھے۔ اب اس کی اپنی جیب میں پیسے ہوں گے اور وہ موںگ پھلی خرید سکے گا اور گڑ کی روپیڈیاں کتنی کڑا کے دار ہوتی ہیں گڑ کی روپیڈیاں۔ عیش خالص عیش۔ اتنی آزادی۔ اتنی آزادی سے مل جائے گی کیا۔ وہ حیران تھا۔

## گلیاں ہی گلیاں

رات علی احمد اور ایلی نے ایک عزیز کے یہاں بسر کی اور صبح سوریے ایلی کو ساتھ لے کر علی احمد کا لج کی طرف چل پڑے ”ہائیں یا ابا کدھر جا رہے تھے۔“

”ایلی سوچنے لگا۔ یہ تو گلیاں ہیں۔ شگ و تار یک گلیاں کیا کالج گلیوں میں ہوتے ہیں اور گلیاں فضول گھوٹے جا رہی تھیں۔ لیکن وہاں کالج تو نہ تھا کوئی۔ وہاں تو عورتیں ہی عورتیں تھیں۔ کھڑکیوں سے لگتی ہوئی عورتیں۔ منڈریوں سے جھانگتی ہوئی عورتیں۔ چوکیوں پر بیٹھی ہوئی عورتیں۔ بال بناتی ہوئی دانتوں پر دنداسہ ملتی ہوئی دوپے سنجاہاتی ہوئی۔ لجاتی ہوئی۔ گھورتی ہوئی۔ چینتی ہوئی۔ چلاتی ہوئی عورتیں اور وہ گلیاں ختم ہونے میں نہ آتی تھیں ایک ختم ہوتی تو دوسرا شروع ہو جاتی۔ ایک مژ جاتی تو دوسرا کھل جاتی۔ گلیاں ہی گلیاں۔ شگ کھلی۔ بودوار گلیاں۔ جہاں علی احمد کے سوا مرد گروں بھیکھائے گزرتے تھے اور ٹیکاریں سینہ ابھار کر چل رہی تھیں۔ وہ تھک گیا۔ ٹکر گلیاں چلے جا رہی تھیں اور ان میں علی احمد سراٹھائے منڈریوں کی طرف دیکھتے ہوئے شہابانہ انداز سے یوں چل رہے تھے جیسے باغ میں ٹھیل رہے۔ دیکھتا گلیاں ختم ہو گئیں۔ چوڑی سڑک آگئی۔ ”وہ تمہارا کالج ہے۔ ایلی، علی احمد نے سامنے والی سرخ عمارت کی طرف اشارہ کیا۔ اور دیکھا یہ۔ ”وہ گلیوں کی طرف اشارہ کر کے بولے ”یہ لا ہور ہے لا ہور۔ خوب جگہ ہے لا ہور۔ ” ہو ہنسنے لگے۔

## مال کالال

علی احمد دو دن وہاں ٹھہرے۔ ایلی دعا گئیں مانگتا رہا کہ وہ چلد رخصت ہوں اور اسے آزادی حاصل ہو لیکن جب سب کام مکمل ہو گیا۔ فیسیں ادا کر دی گئیں۔ کتابیں مہیا کر دی گئیں بورڈنگ میں 17 نمبر کے کمرے میں اس کی چار پائی رکھوادی گئی اور علی احمد رخصت ہونے لگا تو نہ جانے کیوں وہ گھبرا گیا۔

بورڈنگ میں لڑکے ہی لڑکے بھرے پڑے تھے۔ بڑے بڑے لڑکے۔ اونچے لمبے بھرے بھرے جسم کے مردم لڑکے عجیب سے چھروں والی لڑکے بڑی رعنعت سے گھورنے کے حادی تھے۔ جوڑا نٹ کر یوں بات کرتے جیسے تھانے دار ہوں۔

”اے لڑکا۔ ادھر آؤ۔“ اور ”اے تم کون ہو۔ کون ہوتا۔“ وہ ہر وقت موچھیں موڑتے۔ اپنے تہہ بند جھاڑتے رہتے۔ کیونکہ پا جاموں کی جگہ انہوں نے بڑی بڑی چادریں پیٹ رکھی تھیں۔ جن کے تلے طلائی جوتے تھے۔ جن کی نوکیں نگلی رہتی تھیں۔ ان لڑکوں کے ساتھ عمر زیادہ نہ کرتے جو انہیں حقہ پلانے کے علاوہ مشغی چاپی میں مصروف رہتے۔ ایسی انہیں دیکھ کر ڈر گیا اور پھر سبھم گزترہ نہیں کے ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گیا۔

”اے تو کون ہے؟“ ایک لمبارہ ناٹک کمرے میں آگھسا۔ ”کون ہے تو؟“

”جی۔ جی۔ جی۔“ ایسیں گھبرا گیا۔

”جی۔ جی۔ کیا۔ سیدھی بات گرو۔“

وہ چلا گیا واپسی اٹھ بیجھاں کے اردو روڈیو ایاریں گھوم رہی تھیں۔ ہوش میں ہر طرف اونچے لمبے جاث قسم کے لڑکے مذاق اثر رہے تھے۔ ”ٹھہر اولونڈے۔ کہاں جا رہا ہے تو مار رہے تھے۔ منہ چڑا رہے تھے۔“ ایسی بھانگنے لگا۔ ایک بھدی سی آواز پیچھے سے چلا رہی تھیں۔ ”ٹھہر اولونڈے۔“

ارے یہ لڑکیاں کہاں سے آ گئیں۔ ”ایک لڑکا ایسی کار استر ووک کر کھڑا ہو گیا۔“ اس نے زبردستی ایسی کی ٹھوڑی پکڑی لی اور اس کے منہ کو چاروں طرف گھما کر بولا ”یہ دیکھو ماں کالال۔ ابھی ماں کا دو دھن پینا نہیں چھوڑا اور آئے ہیں یہاں کالج میں داخل ہونے کے لئے۔ ماں کے پیٹ اسی سے دویں کر کے آتے ہیں۔“

خوف سے ایسی کی حرکت تلب بند ہوئی جا رہی تھی۔ اس کی کنپٹیاں تحرک رہی تھیں ”جا اپنی ماں کی گود میں جا کر بیٹھ۔“ اس نے ڈھمکی دے کر کہا ”دوز امی کی گود میں جا کر بیٹھ۔“ پھر ایسی کو کچھ معلوم نہیں۔ وہ بھاگ رہا تھا۔ سڑکوں پر بھاگ رہا تھا۔ بھیڑ کو چیرتا ہوا جا رہا تھا۔ لوگ اس کی طرف منہ اٹھا اٹھا کر دیکھ رہے تھے وہ زیریں ایک دوسرے سے کچھ کہہ رہیت تھے۔ ”ماں کی پیٹ سے دویں پاس کر کے آتے

ہیں۔ ”” یہ دیکھو مائی کالاں۔ ہاہاہا۔“

سارا لاہور اس کے راز سے واقف تھا۔ سمجھی اس پر نہ رہے تھے ”پکڑ لو۔ پکڑ لو۔“ وہ پھر بھاگ اٹھتا۔ لڑکیاں نفرت سے اس کی طرف دیکھ کر مسکرا تیں۔ عورتیں ہاتھ چلا چلا کر باتیں کرتیں تھیں۔ اس کا مدخلہ اڑا رہے تھے۔ ”مہٹ بابو۔“ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ بھاگ کر دادی اماں کے پاس جا پہنچ اور وہ اسے تھپک تھپک کر سلاوے۔ ”کیا ہے ججے ایلی۔ سو جا۔ کچھ بھی نہیں۔ پھی بھی تو نہیں۔“ اور پھر مضمین ہو کر وہ رضاگی دکان میں جا چکی۔ ”آؤ بابو ایلی بیٹھ جاؤ۔“ اور وہ پر وقار انداز سے بیٹھ جائے یا ارجمند کے پاس جا کھڑا ہو۔ ”ایلی وہ دیکھو بنیں بھی اور ناگ مست ہوا ہے نا۔“ وہاں اس کی آنیت تھی۔ وہاں لوگ اسے ماں کالاں نہیں سمجھتے تھے۔ وہاں اس کی باتیں ایک حیثیت رکھتی تھیں۔

بازو میں جگہ جگہ چھا بڑی والے موگ پھلی، رویوڑیاں اور چنے چنے رہے تھے لیکن اسے کچھ بھی تو دکھائی نہ دے رہا تھا۔ چاروں طرف بھیاں کنک دندن لکا چھایا ہوا تھا اور نچے اور نچے کھبے سروں پر ٹھما تی ہوئی نالیاں اٹھائے ناج رہے تھے۔

نہ جانے کب تک وہ بازاروں میں آوارہ گھومتا رہا لیکن آخر کار اسے واپس ہو شل میں آنا ہی پڑا۔ واپس آنے کو اس کا جی تو نہ چاہتا تھا۔ اس گنوارخانے کی نسبت شیشیں کے پلیٹ فارم پر بیٹ کروقت کاشنا کہیں بہتر تھا۔ لیکن شیشیں بھی تو ایک اجنبی مقام تھا جہاں پولیس کے سپاہی ہر بیٹھے لیٹھے ہوئے مسافر کوشک کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ اسے کسی عزیز کے گھر کا راستہ بھی معلوم نہ تھا۔

ڈرتے ڈرتے وہ بورڈنگ میں جا داش ہوا وہاں برآمدوں میں گراوڈ میں جگہ جگہ چار پاپیاں پچھی ہوئی تھیں۔ حقے گڑگڑا رہے تھے۔ سفید چادریں جھاڑی جاری تھیں۔ ”اوڈر یے۔ او فنے۔“ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

چپ چاپ وہ کمرہ نمبر سترہ میں جا پہنچا۔ ہائیں وہاں تو کچھ بھی نہ تھا۔ نہ اس کا

ٹرک۔ نہ سوٹ کیس۔ نہ بستر نہ چار پائی کمرے کے دروازے کے قریب برآمدے میں ایک جاٹ کو بیٹھا دیکھ کر وہ اس کی جانب بڑھا۔

”جی۔ جی۔“ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ یہاں اس کمرے میں یعنی کمرہ نمبر سترہ میں یہاں اسماں بستر۔

جاٹ نے بے پرواٹی سے اس کی طرف دیکھا اور لامس کریو لو ”معلوم نہیں۔“ دو موٹھپھول والے جوان سامنے کوٹھے پر چار پائیوں پر پڑے تھے۔ وہ ان کے قریب چلا کیا۔ لیکن ان سے بات کرنا پچھا آسان نہ تھا۔

”کیوں بھئی کیا دیتے ہے۔“ ایک نے چلا کر کہا۔

”پچھئیں جی۔ پچھئیں۔“ ایلی نے کہا۔

”ہوں۔ کون ہے۔ یہاں کیوں گھوم رہا ہے۔“

”جی۔ میں سترہ نمبر میں فرست ائیر میں۔ میں۔ میں۔“ اس کی گھبراہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ ”جی۔ میرا بستر چار پائی۔ ٹرک۔ سب فائدہ ہیں۔“

”ہائیں۔ کیا مطلب کیا ہم چور ہیں۔“ ایک نے منہج مردوڑتے ہوئے پوچھا۔

”جی۔ جی۔ نہیں۔“ ایلی نے جھٹ انہیں یقین دلانے کی کوشش کی ”یہ تو اپنے ہوشل کا نہیں ہے۔“ ایک نے اسے کھنکھا کر کہا ”اڑھ آبے۔“ چوری کرنے آیا ہے تو۔“

”جی۔ جی۔ نہیں۔ میں تو۔“

”بھاگ جایہاں سے ورنہ پولیس کو بلا گئیں گے۔ دوڑ۔“

ایلی پھر بھاگ رہا تھا۔ نہ جانے کہاں کس طر۔ لوگ اسے مشتبہ نظر وں سے دیکھ رہے تھے۔ پولیس میں کے سامنے پہنچ کر وہ گھبرا جاتا اور آنکھ بچا کر نکل جانے کی کوشش کرتا۔ نہ جانے کیوں وہ اپنے آپ کو چور سمجھنے لگا تھا۔ آوارہ۔ چور پلیٹ فارم پر وہ ایک نچ پڑ گیا۔ اسے مسافر خانے کے بخ پر پڑے دیکھ کر پولیس والا آدمکا۔

”ہے۔ کون ہے تو۔ کہاں جائے گا؟“

”جی۔ جی۔“ وہ اٹھ بیٹھا۔

”کہیں بھی نہیں۔“ وہ بولا

”تو یہاں کیوں پڑا ہے؟“

”میں۔ میں۔“ وہ تھپرا گیا اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کہے۔ نہ جانے اسے کیا کہنا چاہئے تھا۔ وہ اٹھ بیٹھا۔

”بھاگ یہاں سے۔“ حوالدار نے موچھوں کوتاؤ دیتے ہوئے کہا۔

ایک بار پھر وہ ویران لاہور کی سڑکوں پر ٹھوم رہا تھا۔ جہاں خوفناک شکلوں والے کتنے بھونک رہے تھے۔ ہر قدم پر وہ ٹھک جاتا۔ لک جاتا۔ نہ جانے کہاں سے کوئی آنکھے گا۔ کتنا بھونک کے گالیا کوئی حوالدار ملے۔ موچھ مرد کراں سے گھورے گا۔ تو بے کس قدر وہ یہاں شہر تھا وہ کتنی چوڑی سڑکیں تھیں وہاں اور وہ کھبوں پر ٹکلی ہوئی بتمیاں یوں ٹھماری تھیں۔ جیسے کسی ڈان کے آنکھوں کی پتلیاں ہوں۔

پھر دھنٹا اسے خیال آیا آخر پولیس والا یہی پوچھتا تھا ناکہ کہ کہاں جائے گا۔ نکٹ کہاں ہے تیرا۔ اس خیال پر وہ پھر سٹیشن کی طرف مڑ گیا۔ بلنگ آفس سے اس نے نکٹ خریدا اور روینگ روم کی طرف چل پڑا۔

پھر جو اسے ہوش آیا تو وہ گاڑی میں بیٹھا اور گاڑی علی پور کی طرف فرائے بھرتی ہوئی جا رہی تھی۔

## پناہ گاہ

علی پور پہنچ کروہ اپنی تمام گز شستہ تکالیف کو بھوگیا۔ اس نے محسوس کیا جیسے ویرانی ختم ہو گئی ہو اور وہ پھر اسے ایک حیثیت سے مالک ہو گیا ہو۔

”اے میلی۔ اے میلی۔“ چاروں طرف سے آوازیں آرہی تھیں۔

”اے میلی۔“ وادی اماں چلا رہی تھی۔ ”تیراول لگ گیا تھا وہاں لاہور میں۔ تو باتیں

دور تن تہا جانا۔ نہ بھی میں تو نہیں چاہتی تو وہاں اکیلا جائے۔“

”ایلی۔“ ارجمند چلا رہا تھا۔ ”تم آگئے۔ اچھا ہوا تم آگئے تم چلے جاتے ہو تو سب گڑ بڑ ہو جاتا ہے۔ اسٹنٹ نہ ہو تو بیچارہ ہیڈ کیا کرے۔ بڑی چیز ہوتی ہے اسٹنٹ۔ ہاں تم نہیں جانتے فتنوں میں اس کی آیا حیثیت ہوتی ہے اور پھر یہاں انکرایڈی آفس ہے۔“

”آگے بایو۔“ رضا نے اپنی لٹکڑی ناگ کو گھماتی ہوئے کہا ”آؤ بیجو۔ اب تو کالج والے بن گئے۔ بایو بن گئے تم۔“

”ایلی۔“ جمیل اسے دیکھ کر مسکرا نے لکا۔ ”آفروچی گلی میں آؤ وہاں آج لالہ نے تازہ گلاب جامن بنائے ہیں۔ آؤ۔“ ”تو آگیا ایلی۔“ سعیدہ نے اپنا خوبصوردار دوپنہ سر پر لٹکھوئے کہا ”آجا۔“ آج رات کو چورپاہی کی بازی لگے گی۔ آئے گانا تو —

”ہاں۔ ہاں۔“ ایلی نے کہا ”ضرور آؤں گا۔“

”ایلی — اب تو کالج کے ٹھاٹھ ہیں نا۔“ حیم صاحب اسے دیکھ کر طنزرا مسکرائے۔

چودھری یہ سن کر بولا ”کیا فرق ہے حیم صاحب۔ یہ تو جیسے پہلے تھا ویسے ہی اب بھی ہے۔ وہی رضا کی دوکان۔ وہی تاش کی گڈی۔“

چچا عظم رک گئے ”کیا کہا چودھری۔ تاش کی گڈی۔ تاش کھیلنے کے علاوہ ان لندوروں کو آتا ہی کیا ہے۔ اللہ آپ کا بھلا کرے۔“ رضاہنسا ”یہی میں کہہ رہا تھا۔“ تو چچا عظم نے رضا کی طرف انگلی سے یوں شست باندھی جیسے اسے گولی کا نشانہ بنارہے ہوں تمہیں نے تو لج پنے کا اڑہ بنارکھا ہے۔ یہ دکان تو محض ایک بہانہ ہے۔“

”ہاں۔“ رضاہنسا ”چچا جی یہی بتا رہا تھا میں انہیں۔ لیکن ان احمدقوں کی سمجھ میں

آئے بھی بات بالکل بھس بھرے ہیں یہ سب اور اور یہ ایلی۔

علی پور آجائے سے ایلی کی ایک حیثیت پیدا ہو جاتی تھی۔ اگرچہ محلے کے بزرگ اور بوڑھیاں اکثر نیچے جھاؤ کر پیچھے پڑے رہتے پھر بھی عیل پور تھا اور لاہور۔ لاہول والاقوہ تو ایک ویرانہ تھا۔ کھونے سے کھوا چکنے کے باوجود ویرانہ۔

لاہور کا خیال آتے ہی ایلی گھبرا جاتا۔ اس کی پیشائی پر پیشہ چھوٹ جاتا۔ لیکن وہ دل ہی دل میں جانتا تھا کہ اسے لاہور جانا ہی ہو گا۔ علی پور میں وہنا ممکن نہ تھا۔ پھر بھی جتنے دن وہ علی ہور رہ سکتا تھا۔ غیبت تھا۔

”اے ہے تیری چھپیں ابھی ختم نہیں ہوئی کیا ہے؟“ دادی اماں اسے چوتھے روز گھورنے لگی۔ ”اب تو والپیں بھی جانے کا یا نہیں جاؤ رہ گردی کرتا رہے گا۔ میں تیرے ابا کو کیا جواب دوں گی۔“

”لیکن میں وہاں بورڈنگ میں جا کر بھوکوں مروں۔“ ایلی کو سوچھی ”لو وہاں تو بلکہ کھانے کو میوے ملتے ہیں تیرے ابا کہہ رہے تھے اس روز تو بھی پاس ہی تھا۔“ دادی اماں نے جواب دیا۔

”ہونہہ میوے۔ وہاں تو روٹی بھی نہیں ملتی۔ بڑے لڑکے سب کچھ کھاجاتے ہیں۔ فرست ائیر والوں کو کون پوچھتا ہے۔

پہلے تو دادی اماں نے ایلی کی بات کا اختبار نہ کیا لیکن جب اس نے دیکھا کہ لاہور کے نام پر ایلی کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتی ہیں تو اسے یقین آگیا۔

”نه بھی میں تو ایلی کو بورڈنگ میں نہ بھیجوں گی۔ اے ہے اپنا فیروز جو رہتا ہے۔ وہاں لاہور میں پھر لڑکا بورڈنگ میں بھوکوں کیوں مرے۔ نہیں بھی میرا ایلی وہاں نہ رہے گا۔ کبھی بھی۔ اپنا گھر نہ ہو تو بھلا مجبوری ہوئی۔ لیکن فیروز کے ہوتے ہوئے لڑکے کو بھوکوں مارنا۔“

نیرو کی جوانی دیر سے داخل چکی تھی۔ لیکن اس کے رخساروں پر سرخی جھلک ابھی تک نمایاں تھی۔ جسم بھرا ہوا تھا۔ چہرہ پر وقار ہونے کے باوجود نہ جانے کیوں بے جان سامحسوں ہوتا تھا۔ شانے چوڑے تھے چال لستادہ تھی اور جسم تنومند اور مضبوط تھا۔ لیکن اس کے باوجود نیروز کو دیکھ کر محسوس ہوتا جیسے اس کی عظمتِ مااضی سے تعلق رکھتی ہو۔ جیسے وہ گزشتہ جاہ و حشمت اور عیش و عشرت کی ایک داستان ہو۔ اس کی آنکھوں میں چمک اور وقار و نوں خصوصیات پر کیک وقت موجود تھیں۔ لیکن ان میں ایک بنامی بے حصی کی جھلک تھی۔ مجسمی اکتا ہٹ اور محرومی۔

نیروز کی زندگی اس ویرانی اور محرومی کے باوجود متوازن تھی۔ جسے پابندی اوقات سے خصوصی تعلق تھا۔ وہ صحیح سویرے جاگ انتہائی خندے پانی سے غسل کرنے کے بعد کپڑے پہن کر چہل فتنی کے لئے باہر نکل جاتا۔ واپسی پر جائے پینے کے بعد چھوڑ اسما مطالعہ کرنا اور پھر کھانا کھا کر کہوئے اتار کر آرام کرتا تھا کہ چائے کا وقت ہو جاتا اور چائے پینے کے بعد وہ پھر کپڑے پہن کر باہر سیر کو چلا جاتا اور واپسی پر کھانا کھا کے لیٹ جاتا۔

نیروز کو باعین کرنے سے قطعی دلچسپی نہ تھی۔ اس کی خاموشی کسی لغراش المیہ کی شاہد تھی۔ نیروز کے کمرے کے قریب ہی ایک کوٹھری میں اس کی ہمیشہ صابہر رہتی تھی۔ وہ ہر وقت چار پائی پر بیٹھی تسبیح پڑھتی رہتی تھی۔ اس کے سر پر ایک خاکستری رنگ کی چادر پڑی رہتی۔ جس میں اس کا سرخ و سپید چہرہ یوں دکھتا۔ جیسے کسی نے اندھیری کوٹھری میں کوئے دہکار رکھے ہوں۔ اس کے سیاہ لمبے بال عام طور پر کھلے لٹکے رہتے۔ ”بیٹھ جاؤ۔“ وہ نووار دکی طرف مسکرا کر دیکھتی اور بڑے اخلاق سے اس سے باعین کرتی اور پھر دفعتاً اس کا قہقہہ گوختا ایک بے پرواہ بے نیاز۔ پر وقار قہقہہ۔ وہ ہر تکلیف اور پریشانی پر قہقہہ مار کر بہتی اور نووار دمحسوں کرتا جیسے وہ دنیاوی تفکرات پر خندہ زن ہو۔ صابرہ کا چہرہ ابڑا پر وقار اور بارعہ تھا۔ اس کا انداز بے حد پراڑ تھا۔

اس کو ٹھڑی کے اردو گرد کئی ایک کوڑھریوں میں صابرہ کی بیٹیاں رہتی تھیں۔ سب چھوٹی لڑکی فیضہ کی شادی کسی سید سے ہونے والی تھی جو کسی گاؤں میں زمیندار تھا۔ سرور کا خاوند ایک معمولی دوکاندار تھا جس کی دوکان لو ہے کے کباڑخانے پر مشتمل تھی وہ روز حسرت زدہ امید سے خاوند کا انتظار کرتی کہ کب دوکان سے چارپیے کما کر لائے اور وہ ہاڈی روپی کا انتظام کرے۔ سرور دن بھر کپڑے ڈھونٹی بچوں کو پیٹتی اور خاوند کو زیریں برا بھلا کہتی رہتی۔ بچے چپ چاپ جیران نکالوں سے کبھی ماں اور کبھی سیڑھیوں کی طرف ویکھتے۔

ایک کوٹھری میں خاوند اجڑے کیڑے پہنے کوئی کتاب پڑھتی رہتی یا سرور کے بچوں کی طرف دیکھ کر ناک بھجوں چڑھاتی۔ فیضہ کو دیکھ کر محبوس ہوتا تھا۔ جیسے وہ اس گھر کی فرد نہ ہو۔ اس کے انداز میں نہ تو مایوسی تھی اور نہ بے نیازی اس ویرانے میں فیضہ ایک سر بزر خطے کی طرح تھی۔ اس کے ہاتھ حنا کے رنگ سے چمکتے تھے۔ اس کے ہونٹ مسکراہٹ سے کھلے رتے اور لبouوں پر کسی ناکسی ڈھولک گیت کی دھن ناچتی۔ جب وہ ڈھولک کے ساتھ گاتی تو اسی معلوم ہوتا جیسے بہار آگئی ہو۔

اوپر واہل منزل میں انور اور اس کی بیٹی مینا رہتے تھے۔ ایک چھوٹے سے کمرے میں انور چوہبھے کے سامنے بیٹھی دیوار کی طرف تکتی رہتی۔ جیسے دیوار کے پار دور بہت دور نہ جانے کیا دیکھ رہی ہو۔ اس کی لٹ جھلک کر منہ پر آگرتی آنکھوں میں ان بھے آنسو چھلتے اور وہ بار بار آہ بھرتی اور سخھی مینا گڑیا تھامے کبھی ماں کی طرف دیکھتی اور کبھی دیوار کی طرف۔ یہ وہ مکان تھا جہاں لاہور میں ایلی کو قیام کرنا تھا۔

فیروز ایلی کا پھوپھا تھا۔ پھوپھی مرچکی تھی اور اب فیروز تہائی کی زندگی بس کر رہا تھا۔ ابتدائی زندگی میں وہ محکمہ پولیس میں اچھے عہدے پر فائز تھا پھر شاید وہ مسلسل حکومت سے اکتا گیا اور اس کے دل میں محاکومیت کی آرزو چکلیاں لینے لگی یا شاید یہ

سب راگ رنگ اور رقص کا اعجاز ہو۔ مسلسل عیش و طرب انسان کے دل میں نسائی آرزوں کیں پیدا کر دیتا ہے۔ بہر حال اسے ایک رقصہ سے محبت ہو گئی اور ایک روز شراب کے نشے میں خود کشی کی عملی مگر ناکام کوشش کی وجہ سے وہ ملازمت سے بر طرف کر دیا گیا اور بالآخر ظہوراً اُن رقصہ کے چوبارے پر جا بیٹھا۔ باالی نے کئی ایک سال اس کی خدمت کی۔ پھر باالی کی اچانک موت پر وہ اپنی تہشیرہ کے گھر آنے پر مجبور ہو گیا تھا اور انہوں نے ایک مکان میں رہتے تھے۔ فیروز خاموشی سے میز پر بیٹھا رہتا یا چار پایی پر لیٹ کر راضی کی یاد میں کھوجاتا۔ ملحقہ کمرے میں صابرہ بیٹھی تبیح کے دانتے نہیں رہتی اور کبھی کھارا کیا نہیں۔ بے نیاز اور پر جلال قہقهہ لگاتی۔ ساتھ ہا ایک نفرہ بھی ”فاتا“، اس تبیح میں بے نیازی اور ازندگی تھی اس نفرے میں جذبہ اور جوش تھا۔ وقار سے بھر پور زندگی احترام سے بھر پور جذبہ۔

اوپر والی منزل میں انور ڈبڈ بائی ہوئی آنکھوں سے دیوار کی طرف دیکھتی اور پھر آہ بھر کر کہتی ”ایلی تم نہیں جانتے ساس اور نندوں نے مینا کے لباکو ہاتھ میں لے رکھا ہے اور میاں آپ بھی تو جانے کس مٹی کے بنے ہیں کہ انہیں کسی بات کا ہوش ہی نہیں راجہ اندر بنے بیٹھے ہیں۔ ہائے ایلی ماں باپ نے مجھے کہاں جھونک دیا۔ میری تو قسمت ہی پچھوٹ گئی۔“ اس کی آنکھوں سے ٹپٹپ آنسو گرتے اور وہ انہیں پلو سے پوچھ کر پھر دیوار کی طرف گلکلکی باندھ کر دیکھنے لگتی۔ اس پر نغمہ مینا اور بھی سہم جاتی اور اسے گڑیا کا کھیل بھول جاتا اور ایلی سوچنے لگتا یا اللہ یہ سب کیا ہے؟ یہ روئی روئی خوبصورت عورت وہ سپنے دیکھنے والا سرخ و پیدا بزرگ اور ایک دوسرے سے بے خبر نیاز، بہنیں اور ان کے بلکتے ہوئے بچے ۔۔۔ وہ حیران ہوتا اور پھر سوچ میں کھو جاتا۔ پھر دفترا صابرہ کا قہقہہ گونتا اور دادتا کا نفرہ بلند ہوتا جیسے وہ غربت اور ان مصائب کا جواں گھر پر مسلط و محیط تھے۔ تمثیل اڑا رہی ہو۔

فیروز کے مکان کے متصل بھنگلی رہتے تھے۔ جن کی لڑکیاں گایا کرتی تھیں۔ ان

## دھنڈ لکا

کے بیہاں روز ایک نہ ایک تقریب رہتی۔ نہ جانے کیوں۔ ہفتے میں ووچار مرتبہ ڈھولک بھجتی اور عورتیں دیر تک گاتیں۔ جسے سن کر فیر وزچہ چاہہ تھر کی طرح چار پاپی تر پر پڑا رہتا اور سامنہ کی تسبیح اور بھی تیزی سے چلتی اور انور کے دو پٹے کا بلو بالکل ہی تر ہو جاتا اور خاور ناک سیکھ کر بھتی تو بے ہے کس قدر چھینتی ہیں یہ بھنگنیں۔ کیسا وہیات محلہ ہے یہ۔“ اور فیضہ شوق سے شاہ نشین پر جائی بھتی اور ان کے گیت سننے میں محو ہو جاتی یا مسحور ہو کر چلانے لگتی ” ہائے آپ کیسی آپھی ڈھولک بھاتی ہیں یہ ہائے میں کیا کروں۔“

صحح سوریہ ایلی منہ ہاتھ دھو کر کالج کی طرف چل پڑتا۔ لیکن نہ جانے کیا تھا اسے جوں جوں وہ کالج کے قریب پہنچتا اس کے دل میں ہوں اٹھنے لگتے۔ دلبی دلبی گھبراہٹ ابھرتی اور اسے چاروں طرف سے گھیر لیتی۔ کالج کی طرف چلتے ہوئے ہر قدم پر اس کی حیثیت کم تر ہو جاتی۔ حتیٰ کہ کالج میں پہنچ کروہ ایک ٹھنگنے میں بدل جاتا اور پھر چاروں طرف بیٹھیزے گلیوں اس کے گرد گھونٹتے اسے گھورتے اور تمثخر اڑاتے۔ بیل کی نگاہیں جبک جاتیں اس کا جی چاہتا کہ کہیں بھاگ جائے دور بہت دور جہاں کوئی نہ ہو۔ جہاں کوئی اس کا تمثخر نہ اڑائے۔ کوئی اسے دھمکی نہ دے جہاں لوگ اس قدر اوپنجے لمبے اور بیتھتا کہ نہ ہوں پھرنہ جانے کیا ہوتا اس کے گرد و پیش ایک دھنڈ لکا سا چھا جاتا اور وہ دھنڈ لکا ان گلیوں کو ایلی کی نظروں سے چھپا دیتا۔ ان کے تمثخر بھرے تھے مدھم پڑ جاتے۔ پھر وہ دیکھتا کہ وہ بازاروں میں گھوم رہا ہے۔ ان جانے بازاروں میں نئی۔ سڑکوں پر یہ دیکھ کر اس کے دل کو اطمینان سا ہو جاتا۔ جیسے اس نے اپنی دنیا اور اپنی زندگی محفوظ کر لی ہو۔ جیسے وہ کسی بہت بڑے خطرے سے نکل آیا ہو۔

اس کے باوجود اس کے دل میں کھٹک سی گلی رہتی کہ وہ کالج میں حاضری نہیں دے

رہا۔ کلام زانٹ نہیں کر رہا۔ بلکہ آوارہ گردی کر رہا ہے۔ گناہ کا ارتکاب کر رہا ہے۔ گناہ کا خیال آتے ہی اس کی نگاہوں میں دو حصائی ہاتھ لٹکنے لگتے اور وہ از سرنو مضطرب ہو جاتا۔ اس اضطراب سے مخلصی پانے کے لئے اس نے کئی ایک طریقے ایجاد کر کے تھے۔ وہ موگنگ پچلی اور رویویان کھانے میں معروف ہو جاتا لیکن موگنگ پچلی اور رویویان ایسی چیزیں صرف وقتی مصروف نیت بہم پہنچا سکتی تھیں۔ اس نے اس سلسلے میں سگریٹ کو بھی آزمایا تھا۔ مگر سگریٹ بھی مفید ثابت نہ ہوئے تھے الشاوه تو گلے میں کھر کھری سی پیدا کرتے تھے۔ جس سے اس کا اضطراب اور بھی بڑھ جاتا تھا ان سب باتوں سے اتنا کر سروں پر بحکمت پھرنا سے تھک کر وہ کسی سینماہال میں چلا جاتا تو بچارہ نے کائلک خرید کر دوڑھائی گھنٹے تک ایکمہ اور پیدا رو بہادر کے کارنامے دیکھنے میں کھو جاتا۔ سینماہال کا انڈھیرا اسے لوگوں کی ٹھوٹتی ہوئی جا چلتی ہوئی پریشانی کن نگاہوں سے محفوظ کر جاتا۔ سینماہال کا انڈھیرا اسے لوگوں کی ٹھوٹتی ہوئی جا چلتی ہوئی پریشانی کن نگاہوں سے محفوظ کر لیتا اور پھر اطمینان سے پیدا رو بہادر کا روپ دھار کر وہ بد معاشری کو پیٹتا اور بالا آخر حصائی ہاتھوں والی حسینہ کو گھوڑی پر چڑھا کر ہوا ہو جاتا۔

لیکن سینما سے فارغ ہو کر جب وہ گھر پہنچتا تو وہ حصائی ہاتھ شہنشین کو تھامے ہوتے جھکی جھکی نگاہوں سے وہ انہیں دیکھتا اور پھر چپ چاپ نگاہ اٹھائے بغیر چوبارے میں جا پہنچتا جہاں انور چارپائی پیٹھی فضا کو گھور رہی ہوتی۔ اسے قریب بیٹھنے دیکھ کر وہ چونکتی۔ ”ہائے ایلی میری قسمت ہی پھوٹ گئی۔ کیا تھا اور کیا ہو گیا۔ ایلی۔“ انہوں نے اس قدر ظلم کیوں کیا مجھ پر۔ میں نے ان کا کیا بگاڑا تھا۔“ اور وہ شپ رو نے لگتے۔

پھر صابرہ کے قہقہے کی آواز سنائی دیتی اور وہی نعرہ ”واتا“ اور پھر متصل کوٹھریوں سے بھگنوں کی ڈھولک اور گیت کی آوازیں بلن ہوتیں۔ ”اگ بال

کے دھوئیں دے پنج روواں لکوڈاں دکھ بھناں دا۔ ہائے بھناں دا۔“

لاہور کی زندگی عجیب زندگی تھی۔ ایلی محسوس کرتا جیسے وہ خواب دیکھ رہا ہو۔ یہ عالم خواب چندر روزہ ہو۔

وہ دھنڈ لگا جو اس نے اپنے گرد وہ پیش بھیر کھاتھا۔ اس کے لئے کس قدر اطمینان بخش تھا۔ کیونکہ اس دھنڈ لکے کے وجہ سے وہ لخراش حقائق سے بیگانہ رہ سکتا تھا۔ لوگوں کی نگاہوں نے فتح کر سکتا تھا۔ لوگوں کو تو ہر آتے جاتے کو نگاہوں سے کری بری حادث تھی۔ ایلی کے لئے سب سے بڑی مشکل لوگوں کی نگاہیں تھیں۔ بازار میں چلتے ہوئے اس کی سمجھیں وہ آتا تھا کہ وہ اپنی لٹکتی ہوئی بانیوں کو کیسے سنبھالے اور اکھڑی اکھڑی گردن کو کیسے قائم رکھے کہ لوگ اس پر تمثیل سے نہ نہیں۔

چار ایک لوگوں کے قریب سے گز نیا ان کے پاس کھڑا ہونا یا اُس سے باقیں کرنا ایلی کے لئے بے حد مشکل تھا۔ بازار کے لوگ تو خیر اکثر بے پرواں اور بے تو جھی سے اس کے پاس گزر جاتے لیکن کالج کا ہر لڑکا اس کی طرف دیکھ کر مسکانے لگتا اور لڑکوں کے گرد اس کا مذاق اڑاتے۔

اس زمانے میں کالج کے لڑکے بھی تو عجیب سے تھے۔ لڑکے معلوم ہی نہ ہوتے تھے۔ یوں لگتا جیسے ہرے زمیندار اور رئیس ہوں ۔۔۔ جو پنجامت کے اجلاس پر آئے ہوئے ہوں۔

جب وہ گاؤں سے لاہور آتے اور پھر سپین سے بورڈنگ تک تانے میں پہنچتے تو ایک عجیب منظر نظر آتا تا نگہ کہ پامدان پران کا نوکر غلام علی۔ فتا یا کریما بیٹھا ہوتا جو ایک ہاتھ میں تمبا کو کا تھیلا دوسرے میں گھنی کا پیپا تھا میں ہوتا۔ چودھری سیٹ پر یوں اکڑفون بیٹھا ہوتا۔ جیسے وہ رئیسی تا نگہ ہو۔ ایک ہاتھ سے موچھ مرد تا دوسرے سے سر کھجاتا۔ سیٹ پر ایک طرف مردے کا مرتبان ہوتا اور دوسری طرف فرشی حقہ جس کی نے بے حد لمبی اور چمکدار ہوتی تھی۔

ان کے قد اونچے لمبے ہوتے تھے۔ انہوں نے کالے اچکن اور بھاری بھر کم شلواریں پہنی ہوتی تھیں اور ان کے سر کی پگڑی کا طرہ گویا تانگے کی چھت کو اٹھائے ہوتا۔

اس کے برعکس ایلی کا چھوٹا اور پرانا گوٹ جوں احمد کو لٹا کر بنایا گیا تھا۔ اس کی سستی اور مختصر سی پتلاؤں اور معمولی ساجوتا۔ یہ تمام چیزیں ساف مانگے کی معلوم ہوتی تھیں اور ایلی کا چھوٹا قد اور پندرہ سال کی عمر شاید انہیں باتون پر کانج کے لڑکے اسے دیکھ کر رہتے تھے۔ لیکن وہ نہ بھی ہفتے تو بھی ایبل کے لئے کانج جانا مشکل ہوتا کیونکہ اس کے دل پر کمتری کا احساسِ مسلط اور محیط رہتا تھا۔ جو اس نے اپنی والدہ سے ورثے میں پایا تھا اور جسے ملی احمد کے گھر کے ماحول نے پالا پوسا تھا گرچہ اس کی وقت دب بھی جاتا۔ لیکن مناسب وقت پر دفاتر ادل کے کنوں سے نکل کر اس پر یورش کر دیتا اس وقت اس کی انا کی نادود لیگتی اور پھر وہ گویا صفحہ ہستی سے معدوم ہو جاتا۔ عین اس وقت اس کے گروہی دھند کا چھا جاتا جو اسے لوگوں کی بے رحم نگاہوں سے محفوظ کر لیتا تھا اور اس دھند کے میں گھومتا گھومتا وہ سینما ہال میں جا پہنچتا اور وہ دھنلی دھنلی تصاویر اسے اپنی آغوش میں پناہ دے دیتیں۔

### پیدا و بہادر

ویسے تو اس زمانے کے لاہور میں بھی خوبصورت عمارت اور سڑکیں تھیں خوشنما و کامیں اور ہوٹل بھی تھے۔ اگرچہ تعداد میں بہت کم تھے۔ لیکن جس لاہور میں ایلی رہتا تھا وہ لاہور عظیم الشان عمارتوں بڑے بڑے ہوٹلوں اور دوکانوں سے بجے ہوئے باغات اور خوبصورت سڑکوں سے قطعی طور پر خالی تھا۔ فیش ایبل علاقے میں جانے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ اس نے کئی ایک مرتبہ بڑی دوکان میں داخل ہونے کی کوشش کی تھی۔ مگر اس کا دل دھک کرنے لگا اور پیشانی پسینے سے بھیگ گئی تھی اور وہ چپ چاپ سر جھکائے وہاں سے چلا آیا تھا۔ مال روڈ پر جانا اس کے لئے قطعی

طور پر ناممکن تھا۔ وہاں لوگ اکٹھ کر چلتے تھے اور انہیں دیکھ کر ایلی محسوس کرتا جیسے اس کی ڈولتی ہوئی نا۔ کسی عظیم الشان جہاں سے ٹکرانے لگی ہو۔ وہ سہم جاتا۔ پڑھی پر چڑھتا اور بڑھی سے اتر کر بڑک کے کونے پر سمت کر کھڑا ہو جاتا۔ سینما دیکھنے کے لئے وہ اس ہال میں جاتا جو عام سا ہوا اور جہاں عام سے لوگ جاتے ہوں۔ جس کی عمارت عظیم الشان نہ ہو جس میں داخل ہوتے ہوئے وہ تکبیر اہم محسوس نہ کرے۔ اس زمانے میں لاہور میں صرف چار ایک سینما ہاں تھے ایک بھائی دروازے کے باہر ایک ہیرا مندی میں اور ایک شاہ عالمی کے باہر اور یہ تینوں ہال معمولی اور گھٹیاں تم کے تھے جہاں آ جائی سے جا سکتا تھا۔

میکلوڑ رو دا اس زمانے میں ایک ویران ہرک تھی۔ جس پر ایک بیٹھی سی عمارت میں ایک سینما تھا۔ یہ عمارت اگرچہ چھلان عظیم الشان نہ تھی مگر وہاں جانے والے تماشای قطعی طور پر مختلف تھے اور سینما کے ماحول سے انگریزیت اور فشن کی بوآتی تھی۔ وہاں جانا ایلی کے بس کی بات نہ تھی۔ گیا تو وہ کئی ایک بار تھا۔ ایک روپے کا ٹکٹ خریدنے کے لئے ٹکٹ گھر تک پہنچ بھی تھا۔ مگر پھر وہی دھند لکا چھا گیا تھا اور پھر جب وہ دھند لکا چھنا تھا تو وہ شاہ عالمی گیٹ سینما کے ٹین ہال میں بیٹھا مسٹر زین آف مائرہ دیکھتے ہوئے موگ پھلی کھارہا تھا۔ ان دونوں فلم خاموش ہوا کرتے تھے۔ ایک فلم ہرینوں چلا کرتا تھا۔ کیونکہ اس زمانے میں سیریل فلم دکھانے جاتے تھے۔ ممکن ہے بہت انسٹی چیوٹ اور ایک پارہ ہال میں ایسے فلم بھی دکھانے جاتے ہوں جو صرف وہ بارہ ریلوں میں ختم ہو جاتے ہوں۔ لیکن اس تفصیل کے متعلق ایلی کو کچھ معلوم نہ تھا۔ بہر حال شہر کے سینما گھر میں بارہ پندرہ اپی سوڑ دکھانے جاتے تھے۔ جن کے اختتام پر ہیر و کسی بہت بڑی مشکل میں پھنس جاتا تھا اور بد معاشوں کے زرنگ میں ہیر و کن اپنی عزت اور جان بچانے کی خاطر ہیر و کی امداد کے لئے دعائیں مانگ کر اس کا انتظار کرتے کرتے ہار کر مایوس ہو جاتی تھی۔

خاموش فلم دیکھنے میں ایک خوبی ضرور تھی۔ ہر چند ایک منٹ کے بعد چادر پر انگریزی میں مکالمے یا بیانیہ عبارت آ جاتی تھی اور ہال کے پچھلے حصے سے گلنگاہٹ سی بلند ہوتی یہ مکالمے اور عبارتیں ایلی کے لئے واحد ذریعہ تعلیم تھیں۔ کیونکہ کالج میں یکچھ میں حاضر ہونا یا سابق حاصل کرنا اس کے لئے ممکن نہ رہا تھا نہ ہی اسے یہ معلوم تھا کہ جماعتیں کہاں پہنچتی ہیں اور کون فرو فیسر انہیں پڑھاتے ہیں۔

پہلے دو سال کے دوران میں ایلی کا نام کسی ایک مرتبہ کالج سے خارج ہوا لیکن ہر بار کسی نہ کسی طرح علیٰ احمد کو خبر مل جاتی اور وہ علیٰ پور کے کسی عنزیز کو اطلاع دے دیتے اور جلد ہی محلے کا کوئی بزرگ علیٰ پور سے آپنی پتائی اور دو ماہ کی دن لمبے چوڑے یکچھ پلاکر اور ایلی کی قیس ادا کر کے واپس چلا جاتا اور ایلی کا نام ایک بار پھر کالج کے رجسٹر میں درج ہو جاتا۔ ایک مرتبہ تو خود علیٰ احمد سے داخل کرنے کے لئے آگئے اور انہوں نے ایلی کو یکچھ پلانے کی جگہ ایک اور طریقہ اختیار کیا۔ وہ باری باری ایلی کے تمام پروفیسروں اور کلرکوں سے ملے اور ایلی کو ان سب سے متعارف کرایا۔ پروفیسر جیران تھے کہ یہ کون لڑکا ہے کیونکہ انہوں نے ایلی کو جماعت میں کبھی نہ دیکھا تھا۔

اس واقعہ سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ ایلی کی جگہ کسی حد تک دور ہو گئی۔ وہ دھندا کا اب صرف کالج کے برآمدوں سیڑھیوں اور میدان تک محدود و رہ گیا اور کلاس روم کا مطلع کھل گیا اب وہ بھاگ کر برآمدے سے گزرتا اور کلاس روم کی آخری نیچ پر بیٹھ جاتا اور پھر جب جماعت ایک یکچھ سے فارغ ہو کر دوسرے کمرے کی طرف جاتی تو وہ پہلے ہی بھاگ کر کسی کو نہ میں جا کھڑا ہوتا تاکہ لڑکوں کی نیگاہیں اس پر نہ پڑیں۔ لیکن اس کے باوجود حاضری کے رہنماؤں سے اس کا ناج کٹنا بند نہ ہوا۔

## طالب خیریت

خط لکھنے میں علیٰ احمد کو کمال حاصل تھا انہیں ہر اس بات پر دلچسپی تھی جو لکھنے سے متعلق ہو مثلاً اگر میں ان کے لکھنے کے سامان کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ علیٰ احمد میز پر

بیٹھنے کرنے میں لکھ سکتے تھے۔ لکھنے کے لئے انہیں فرش پر بیٹھنے کی ضرورت پڑتی۔ ان کی دوست ہمیشہ تھاں میں رکھی ہوتی۔ قلم کی نیس گھس کر اس قدر موٹی ہو جاتیں کہ دیکھنے والا شاخت نہ کر سکتا تھا کہ تحریر ملک سے لکھی گئی ہے۔ یا ریلیف کے نب سے لیکن علی احمد کو گھسی ہوئی نب سے لکھنے کا شعنق تھا وہ ہر نب کو گھس کر ریا جانے کیسے مونا کر لیا کرتے اور پھر اطمینان سے فرش پر بیٹھ کر لکھا کرتے اور اس شغل میں اس قدر کھو جاتے کہ انہیں گروپیش کا احساس ہی نہ پڑ رہتا۔ یہ شخص اتفاق کی بات تھی کہ لکھنے کے سلسلے میں ان کی توجہ حساب کتاب اور تاریخ پیدائش ووفات اور شادی بیاہ تک محمد و درہ گئی تھی۔ وزراء اگر وہ تصنیف و تالیف کی طرف وجہ دیتے تو نہ جانے کیا تا انہیں ظہور میں آتے۔

خط لکھنے کے معاملے میں ان کی قابلیت کا اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے۔ ایک تو نہ میں وہ مناسب القابات اور معقول انداز تحریر کے شدت سے قائل تھے۔ ہربات کو مناسب جزئیات اور حصوں میں تقسیم کرتے اور پھر با قاعدہ طور پر انہیں نمبر وار تحریر کرتے۔ ایلی اپنے خط میں چلاتا ”جناب والا! آپ نے ابھی تک خوش نہیں بھیجا میں سخت تکلیف میں ہوں۔ کانج کی فیس ادا کرنا ہے۔ جسم پر کپڑا نہیں۔ جیب میں پائی نہیں۔ از راہ کرم واپسی ڈاک خوش بھیجئے تاکید مزید ہے، میں سخت تکلیف میں ہوں۔“

بواپسی واک ان کا گرامی نامہ ایک کارڈ پر موسول ہوتا کیونکہ وہ لفافہ لکھنے کے قابل نہ تھے ”برخوردارالیاس تمہارا خط ملا۔ حالات سے آگاہی ہوئی یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ تم خیریت سے ہو اور خوش و خرم ہو۔ یہاں سب خیریت سے ہیں اور ہم سب تمہاری خیریت کی خبر کے طالب ہیں۔ علی احمد۔“

علی احمد کا خط پڑھ کر ایلی کے تن بدن میں آگ لگ جاتی۔ غصے میں وہ پھر سے ایک لمبا چوڑا خط لکھتا ”یہاں بالکل خیریت نہیں، حالات بالکل نا مساعد ہیں۔ میں

مرا جا رہا ہوں۔ میری خبر بھیجئے۔ اگر آپ نے خرش نہ بھیجا تو نہ جانے کیا ہو جائے گا۔  
بواپسی ڈاک خرچ رو انہ سمجھیے۔“

بواپسی داک علی احمد کی طرف سے کارڈ موصول ہوتا۔ برخوردار تمہارا خیریت نامہ ملا۔ اسی طرح ہر دوسرے دن اپنی خیریت کی خبر بھیجتے رہا کروتا کہ باعث فکر نہ ہو۔ اس زمانے میں ایلی کو علی احمد کی فنا کاری کا احساس نہ تھا۔ ان خطوط سے محفوظ ہونے کی بجائے چڑھ جاتا۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ ایلی کو مضمون خیریت با توں پر نہ نہیں آتا تھا۔ وہ ایسی باتوں پر اپنا تو ازن کو بیٹھتا تھا اس کی شخصیت میں تو ازن اور وضع داری سرے سے مفتوحی نہیں تھی۔

علی احمد ایلی کو خرش ضرور بھیجا کر لئے تھے اس کی ضروریات سے زیادہ بھیجتے مگر از طور پر انہیں شک بخشی کی عادت تھی وہ خرش اقسام میں بھیجتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ پہلی قطع کو حیب میں اس امید پر اٹھائے پھرتا کہ دوسرا قطع آنے پر فیس ادا کروے گا۔ لیکن جب دوسرا قطع موصول ہوتی تو پہلی خرش ہو چکی ہوتی اور اسے تیسی قطع کا انتظار کرنا پڑتا۔ اس کے علاوہ علی احمد کے خطوط سے جو دھند لگا پیدا ہو جاتا اسے صاف کرنے کے لئے بھی تو کافی خرچ ہو جاتا تھا۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوتا کہ اس کی مجالی حالات ہمیشہ بگڑے رہتے اور اس کا سینما دیکھنا، گنڈ بیڑاں چونا موگ پھلی اور ریوٹریاں کھانا اور بھی ضروری ہو جاتا۔

ان مسائل سے اکتا کروہ انور کے پاس جا بیٹھتا۔ انور بال کھولے آنکھیں بنائے دیوار کی طرف گھورتے ہوئے کہتی ہائے ایلی کیا ہو گیا۔“ ایلی کا دل چاہتا کہ وہ بھی کسی سے عشق کی لوگا کر بیٹھ جائے اور علی احمد کے خطوط اور کالج کے دھند کے سے نجات حاصل کر لے لیکن اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ عشق میں انور کی یہ کیفیت دیکھ کر کیسے عشق لگائے اتنی کوششوں کے باوجود وہ کسی سے عشق نہ لگا سکا تھا۔ کسی کے سامنے جا کر تو اس کی نگاہیں جھک جاتی تھیں۔ دل دھک کرنے لگتا تھا اور

زبان بند ہو جاتی تھی۔ پھر عشق کیسے لگتا اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے۔

پھر اسے خیال آتا کیوں نہ زیراں سے عشق لگا لوں۔ وہ نہ زیراں جو علی پور کی اس اندر ہیری ڈیورٹی میں اس کا انتظار کیا کرتی تھی اور جب وہ داخل ہوتا تو کھلکھلا کر نہس پڑتی ”تو ڈر گیا۔ میں ہوں ۔ ایسی میں ہوں“، اور پھر ایک خوبصورت جسم اس کی طرف پڑھتا دوسیا آنکھیں بٹوٹے ہونٹ اور بحدار چہرہ اور وہ گھبرا کر بھاگتا۔

نہ جانے اسے نہ زیراں سے عشق کیوں نہ ہوتا تھا۔ نہ زیراں واحد لڑکی تھی جو اسے دیکھ کر اس کی طرف ہاتھ بیڑا لایا کرتی تھی۔ باقی لڑکیاں تو اس کے وجود ہی سے منکر تھیں۔ اے تعلیم تھی کہ تین تو صرف ایک نکاح غلط انداز ڈال کر اپنے کام میں مصروف ہو جاتیں۔ مصیبت یہ تھی کہ ایسی ان لاکیوں سے ڈر لگتا تھا جو اسے دیکھ کر آگے پڑھتی تھیں اور وہ تمام لڑکیاں اسے پیاری لکھتی تھیں جو اسے دیکھ کر فوراً منہ موڑ لیا کرتی تھیں۔ عجیب مصیبت تھی۔ اس مسئلہ میں اسے مشورہ دینے والا بھی تو کوئی نہ تھا۔ صرف ایک ارجمند تھا۔ لیکن وہ تو اس معاملہ میں ایسی کی بالکل مدد کر سکتا تھا۔ وہ تو انکرایندی ماباؤں کو ایک کھیل سمجھتا تھا اور لڑکیوں سے یوں کھیلتا تھا۔ جیسے وہ کھلوتے ہوں انہیں لبھاتا۔ چھیڑتا ان کا مذاق اڑاتا۔

اس کے برعکس ایسی ان کی عزت کرتا تھا۔ انہیں پاکیزہ سمجھتا تھا اور خاموشی سے ان کی پرستش کرنا چاہتا تھا۔ وہ عشق کو ایک بلند و بالا چیز سمجھتا تھا ایک ایسا تعلق جسے جسم سے کوئی واسطہ نہ ہو۔ لیکن وہ تعلق کیسے قائم کیا جائے اس کے بارے میں اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا۔

دو سال کا لمحہ میں گزارنے کے بعد اسے معلوم ہوا کہ حاضر یوں کی کمی کی وجہ سے اسے امتحان میں نہیں بھیجا جا سکتا۔ یہ خبر سن کر گھبراہٹ تو ضرور ہوئی لیکن سصرف اس خیال پر کہ علی احمد کو کیا جواب دے گا، یہے دل ہی دل میں اس نے خوشنی محسوس کی کہ امتحان کی مصیبت سے چھکا رہ ہوا اور وہ فوراً گاڑی میں سوار ہو کر علی پور روانہ ہو گیا۔

امتحان کے لئے نام نہیں جاسکتا تو پھر لا ہور میں رہنے کا فائدہ؟

## واپسی

ایلی کے احاطے میں قدم رکھتے ہی محلے والیوں نے شور مچا دیا — ”کون آیا ہے؟“

”اے ہے ایلی ہے ماں جی اپنی بارجہ کا بیٹا۔“

”اچھا بارجہ کا بیٹا آیا ہے اللہ زندگی دراز کرے۔“

”اب تو بہن بابو بن گیا ہے۔“

”بڑا لائق اڑکا ہے یہ یاں میں تو پہلے سے ہی جانتی تھی۔ اے ہے ادھر تو ۲۳ کے شرما تاکس سے ہے۔ تیری خلائیں اور پھوپھیاں بیٹھی ہیں کوئی غیر نہیں۔“

”چاپچی بڑا شرمیلا اڑکا ہے۔ بڑا اچھا ہے اور یہ محلے کے چوہرے تو بے طوفان مچا رکھا ہے۔ انہوں نے۔“

”ابھی پیدا ہوئی نہیں پاتے اور شرارتیں پہلے ہی شروع کر دیتے ہیں۔“

”لیکن ایلی ان اڑکوں سانہیں۔“ — ”اے ہے بہن،“ چاپچی بولی۔ ”ماں کے گھر کا چہاغ اور وہ علی احمد وہ تو بہن اپنی ہی دھن میں لگا ہے۔ بس ہر سال نئی نویلی ملے پرانی تو بائی ہو جاتی ہے۔“

نہ جانے محلے میں جب بھی ایلی کی بات شروع ہوتی تو جلد ہی علی احمد اور اس کے شوق کا مذکورہ کیوں چھڑ رجاتا اور پھر لوگ مسلسل طور پر علی احمد کی باتیں کرتے رہتے جیسے ایلی کا مذکورہ محض علی احمد کی بات چھیڑنے کیلئے ایک بہانہ ہو یا محض ایک تمہید۔ محلے کی عورتیں جب بھی علی احمد کی بات چھڑتیں تو ایلی ان کی بات اور انداز میں عجیب تفاصیل محسوس کرتا۔ کہنے کو تو وہ علی احمد کے خلاف شکایات کرتیں اور ان کی بری عادت پر ہاتھ دھرتیں مگر ان کے انداز سے معلوم ہوتا۔ جیسے وہ علی احمد کو سراہ رہی ہوں جیسے ان کی وہ خصوصیت بے حد پیاری ہو اور علی احمد کا مذکورہ شروع کرنے کے بعد ہو

اسے جاری رکھنے پر مجبور ہوں۔ اسے برا بھلا کہتے ہوئے ان کی آنکھوں میں چمک لہراتی ہوتی مسکراہٹ کی وجہ سے کھل جاتے اور ملکی سی سرخی نہ جانے کہاں سے ابھر کر خساروں پر جھلکتی۔ ایسا کی سمجھے میں نہ آتا تھا کہ یہ کیسی نکتہ چینچتھی۔ کہتی کچھ اور کرتیں کچھ اور سمجھاتی کچھ تھیں۔ اثر کچھ اور واقعی تھیں۔

ہاجرہ سے جب وہ ہمدردی جتنا تھیں تو ایلی کو محسوس ہوتا کہ وہ ہمدردی کے پردے میں وہ حقیقت اس پر ترس کھارہ ہیں ”بائے بیچاری ہاجرہ۔“ اماں کہتی ”لیکن اس کو کیا پروا۔ علی احمد جو چاہے کروے۔ اس کی بلاستے لگاتا پھرے عشق جہاں اس کا جی چاہے۔“

”وہ تو رنگیلا راجہ ہے“ دوسرا مسکرا تی۔

اس پر ایلی محسوس کرتا کہ جیسے وہ در پر وہ با جرہ پر نہیں رہی ہوں اور علی احمد کی اس پیاری خصوصیت پر بھولے نہ ساتی ہوں۔ اس مرتبہ ایلی نے پہلی دفعہ محلے والیوں کی اس دورخی کو شدت سے محسوس کیا۔ ایلی کے احساسات میں عجیب قسم کی گہرائی پیدا ہو رہی تھی۔ روز بروز وہ زود حس ہوتا جا رہا تھا۔ ایسی باتیں اسے چھیننے لگی تھیں۔

پہلی مرتبہ اس نے محسوس کیا کہ محلے والیوں نے ان کا مژرا ق بنا رکھا ہے۔ انکا ہا جرہ سے سستی ہمدردی جتنا وہ حقیقت اپنی عظمت کا اظہار کرنے کا ایک ذریعہ تھا وہ ہا جرہ کے لئے کچھ نہ کر سکتی تھیں نہ ہی وہ علی احمد سے شکایت کر سکتیں۔ شکایت کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ انہیں تو الثانیان کی یہ عادت پسند تھی۔ علی احمد کی شخصیت پسند تھی اور اخلاق کے متعلق تو وہ صرف عظفر مانا جانتی تھیں۔ یہ سوچ کر اس نے محلے والیوں کی باتوں سے اپنی توجہ ہٹالی۔

شہریت

اتفاق سے انہیں دنوں رخصت لے کر شریف علی پور آگیا اور وہ پھر سے شریف میں کھو گیا۔ شریف نے ایلی کی طرف دیکھا اور اپنی نیم و آنکھیں ایلی کے چہرے رکائز

دیں۔ ایلی نے جیرانی سے شریف کی طرف دیکھا۔ اس سے بات کرنے کی کوشش کی مگر وہ ویسے ہی چپ چاپ اس کے منہ کی طرف تکتا رہا۔ حتیٰ کہ ایلی محسوس کرنے لگا۔ جیسے اس کی نگاہیں چیزوں کی طرح اس کے جسم میں دھنسی جا رہی ہیں۔ اس کی نس نس میں رینگ رہی ہیں۔

شریف کے ہونٹوں پر قبسم چھالکا ”گھبرا گئے۔“ وہ بولا ”ابھی سے گھبرا گئے۔“ اور وہ پھر اس طرح عکس لیکی باندھ کر ایلی کی طرف دیکھنے لگا اور اس کی نگاہوں میں عجیب سی مستقیمتی۔

”مجھے جانا ہے۔“ ایلی نے گھبرا کر ایک مرتبہ پھر دیکھنے کی کوشش کی۔

”تم نہیں جاسکتے ایلی۔“ شریف مسخر رہا۔ تم میری نگاہوں سے او جھل نہیں ہو سکتے۔ نہیں بیٹھے رہنا ہو گا۔ میرے روپ و میری نگاہوں کے سامنے اور میں تمہیں دیکھتا رہوں گا۔ حتیٰ کہ میری آنکھیں پانی ہو کر بہہ جائیں۔ تم نے اس کو دیکھا ہے۔ تم کے پاس رہے ہو۔ یوں ہی تم اس کے روپ بیٹھا کرتے ہو گے اور وہ تمہیں دیکھا کرتی ہو گی۔ تم نے اس مکان میں وسال بسر کئے جس میں وہ رہتی ہے۔ تم اس فضا میں سانس لیا کرتے تھے۔ کتنا خوش قسمت ہوں میں جو تمہیں دیکھ رہا ہوں۔“ شریف کی آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا مگر اس کی آنکھیں اسی طرح ایلی کو گھوڑے جا رہی تھیں۔ اس کے منہ سے حسب معمول رال بہہ رہی تھی۔ چہرے پر حسرت ویاس کی دیزرتہ چھٹی ہوئی تھی اور وہ اپنی روپیاد کہے جا رہا تھا۔

”کیا وہاں تن تنہارہتی ہے۔ اتنی بھیڑ میں تن تنہارہتی ہے ظالموں نے اسے وہاں قید رکھا ہے۔ انہوں نے اس کے بازو کاٹ دیئے اور تڑپ تڑپ کروقت گزر رہی ہے۔ اس نے تم سے کچھ کہا تھا میرے بارے میں۔“ شریف رک گیا۔

ایلی کوئی میں سر ہلاتے ہوئے دیکھ کر شریف نے لمبی آہ بھری ”وہ کسی سے بات نہیں کرے گی۔ انہوں نے اسے اس قدر رُدا دیا ہے کہ وہ گھٹ کر مر جائے گی مگر کسی

سے دل کی بات نہ کہے گی اور \_\_\_\_\_ اور \_\_\_\_\_ "جو شہ میں اٹھ بیٹھا" یہ سب  
اس ڈائن کی شرارت ہے۔ جیسے تم دادی اماں کہتے ہو۔ اس خبیث بڑھیا کی۔ وہ ہم  
دونوں کے درمیان دیوار بن کر حائل ہو گئی۔ اس نے وہ کھڑکیاں کیلوں سے بند  
کروادیں جو اس طرف کھلتی تھیں۔ وہ روزانہ انہیں سے بھرا وادیے تھے۔ جن سے  
اس کے آواز مجھ تک پہنچ سکتی تھی۔ "شریف بولے جارہا تھا اور ایلی حیران اس کے  
سامنے بیٹھا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کہے۔ کیا کرے۔ کس طرح اپنی  
ہمدردی کا انتظار کرے۔"

دفعتاً سعیدہ داخل ہوئی۔ "شرم نہیں آتی تھا،" اس نے حنا مالیدہ ہاتھ لہراتے  
ہوئے کہا۔ "اس بچہ کو ماں منہٹھا کر رہتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ اس بیچارے کو کیا  
سنارہا ہے تو اپنا قصہ۔ اسے کیا معلوم کیا ہوئی ہیں یہ باتیں۔ خوانخواہ کا پاکھنڈ چار کھا  
ہے۔ تو تو عورتوں سے پہلا ہو گیا۔ اے ہے مرد ہزاروں جگہ آنکھیں لڑاتے ہیں اور  
پھر اپنے اپنے دھنڈے میں لگ جاتے ہیں۔ مگر یہ میاں ہیں کہ مجنوں بننے ہوئے  
ہیں۔ چاہے دوسرے کو ذرا احساس نہ ہو۔ یہ اپنی جان بیکان کئے جائے گا۔ جا ایلی تو  
اپنے گھر۔" اس نے حنا مالیدہ ہاتھ سے اس کا منہ سہلاتے ہوئے کہا یہ میاں تو  
مجنوں بننے کی قسم کھائے ہوئے ہیں۔

اس وقت ایلی کو سعیدہ کے ہاتھ کا لمس ناگوار گز را۔ اسے شریف کے پاس سے  
چلے آنے سے دکھنی ہوا۔ لیکن اس دکھ میں خوشی کا دبادبا غصر بھی تھا۔ کیونکہ شریف  
کی باتیں سن کر اس کے دل میں جو بات کا ایک طوفان اکٹھا ہو چکا تھا۔ جو اسے  
مضطرب کئے جا رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کہیں اکیلے میں جا کر رو دے۔ شریف کے  
دکھ پر نہیں بلکہ اپنے دکھ پر اپنی بد قسمتی پر کہ وہ کسی سے محبت نہ کر سکا۔

## ماں کا آنسو

اگلے روز جب وہ شریف کی طرف جانے کو تیار ہوا تو اماں نے اس کا بازو تھام لیا

”ایلی ٹھہر جا مجھے تجھ سے کچھ کہنا ہے۔“ ایلی گھبرا گیا۔ کیا اس بھی شریف کے خلاف ہیں۔ کیا وہ بھی نہیں چاہتیں۔ کہ میں اس سے ملوں۔

”ذرائعہ ٹھہر جا۔“ اماں بولی ”بیٹھ یہاں الی میں بھی چلتی ہوں تیرے ساتھ۔“ وہاں بیٹھا سوچتا رہا نہ جانے اماں نے اسے وہاں کیوں بٹھایا تھا نہ جانے وہ اس سے کیا کہنا چاہتی تھیں۔ لیکن وہ ہمیشہ بات کہہ دیا کرتی تھیں۔ یوں تو انہوں نے کبھی نہ کہا تھا۔ ایلی ٹھہر جا مجھے تجھ سے کچھ کہنا ہے۔

کچھ دیر کے بعد اماں نے اس کا باتھ پکڑ لیا اور اسے نیچے پلے گئی۔ چالی منزل میں اس نے ایک کمرے میں جا کر اندر سے کندھی لگائی پھر وہ ایلی کی طرف پڑھی۔ ایلی کا دل دھک دھک کر رہا تھا نہ جانے وہ اس سے کیا کہنے والی تھیں۔

”ایلی۔“ وہ بولی ”میری عزت تیرے ہاتھ میں ہے اگر تو میری بات مان لے تو میں سرخ رو ہو جاؤں گی اور اگر تو نے انکار کر دیا تو بس سمجھ لے کہ آئندہ سے تو ماں کا نہیں باب پ کا بیٹا ہو گا۔“

ایلی حیران تھا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اماں کی عزت کیسے بچا سکتا تھا۔ آخروہ کوئی بات تھی۔ جس پر اماں کی عزت کا دار و مدار تھا اور اس کی عزت ہی کیا تھی گھر میں۔ اس کی حیثیت تو نوکروں کی سی تھی۔ پھر عزت کی بات کرنا اور عزت بچانے کا سوال، ایلی کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا۔

ہاجرہ نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ ”پھر تم جو چاہے کر لینا ایلی اپنی بات پر قائم رہنا یا بدلا جانا لیکن اس وقت ہاں کر دو اگر تم نے ہاں نہ کی تو تمہارے ابا تمہیں اپنے رشتہ داروں کی جھوٹی میں ڈال دیں گے اور تم مجھے سے دور ہو جاؤ گے۔“

”لیکن اماں یہ سب کیا ہے؟“ ایلی نے گھبرا کر پوچھا۔ ”کچھ بتاؤ تو مجھے پتہ چلے۔“

”تمہارے بھلے کی کہتی ہوں بیٹا۔“ وہ بولی ”اگر میں نے ابھی ابھی کچھ نہ کیا تو

وہ نہ جانے کیا کر دیں گے۔ تو تو انہیں جانتا ہی ہے۔ وہ اچھے لوگ نہیں تو تو جانتا ہی ہے بیٹا۔“ یہ کہہ کر وہ رونے لگی۔

”لیکن بات کیا ہے اماں۔“ وہ گھبرا گیا۔

”تو وعدہ کرے گا تو میں بتاؤں گی۔“ اماں نے جواب دیا۔ ”بس سمجھ لے کہ تیری بہتری ہی کی بات ہے۔“

”بھلا میں کوئی ایسی بات کر سکتی ہوں جو تیرے لیے اچھی نہ ہو۔“ بس تو ایک بار ہاں کہہ دے۔“

”اچھا اماں جو آپ کی مرضی۔“ اس نے بات سمجھے بغیر ہی شکاش سے نجات حاصل کرنے کے لیے کہہ دیا جو اس پر مسلط ہوئی جا رہی تھی۔

”اللہ عمر دراز کرے رخوشیاں نصیب کرے۔“ ہاجرہ کی باچھیں کھل گئیں۔ ”میں جانتی تھی تو میری بات روشن کرے گا۔ میں جانتی تھی تو مجھے چھوڑ کر ابا کی طرف نہ جائے گا۔ تو دیکھ لجو تیرے لیے ایسی اچھی دوہن چنی ہے میں نے جولاکھوں میں ایک ہے۔ لاکھوں میں۔ محلے میں اس سے بہتر لڑکی نہیں مل سکتی۔ کل تیری منگنی ہو جائے گی اور پھر تیرے ابا کے لیے ناممکن ہو جائے گا کہ وہ تجھے اپنے رشتہ داروں کے باندھ دیں۔“

ایلی چیرانی سے اماں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی سمجھیں نہ آ رہا تھا کہ آخر اماں اس بات کو اتنی اہمیت کیوں دے رہی تھیں۔ اتنی سی بات کو اس قدر را ہم کیوں سمجھ رہی تھیں۔ اس کے ذہن میں تو ان دونوں اس معاملے کی اہمیت نہ تھی۔ اس کا ذہن ایک سادہ ورق تھا جس پر محبت اور ازاد و امی زندگی کا کوئی مہم نقش بھی مرقوم نہ تھا۔

”لیکن اماں۔“ اس نے بصد مشکل کہا۔ ”میں مہندی نہیں لگاؤں گا۔ میں انگوٹھی نہیں پہنؤں گا۔“ اس کے ذہن میں منگنی اور شادی کے متعلق سب سے بڑی مشکل مہندی اور انگوٹھی تھی۔

”تو کچھ بھی نہ کیو۔ جیسے تیرا دل چا ہے۔ میں کوئی رسم بھی نہ ہونے دوں گی۔  
بس مجھے تو صرف تجھے نامزد کرنا ہے۔ تیرے ابا کے رشتہ داروں سے بچانا ہے اور  
میرا کوئی مقصد نہیں۔“

چند دنوں کے بعد محلے کے چوگان میں علی پور کا بہترین بینڈنگ رہا تھا۔ ایلی اور  
گلشوم کے گروں کے درمیان آنے جانے والیوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ عورتیں مرصع  
اور رشیمیں کپڑے پہننے اور ہر سے ادھر منکر رہی تھیں۔ لڑکیاں گروں کو دیکھ کر ”اوی  
الله“ کہہ کر گونجھٹ میں چھپ جاتیں۔ بیوڑھیوں نے شایدیم کو چھپانے کے لیے  
ہوتوں پر انکیاں رکھی ہوئی تھیں۔ محلے کی چوڑھریاں مٹھائی کے تھال اٹھائے گھر  
گھر لڈو بانٹ رہی تھیں۔ محلے میں منگنی پر پہلی مرتبہ بتا شتوں کی بجائے موٹی چور کے  
لڑو بانٹے جا رہے تھے اور ایلی اس ہنگامے سے دور رضا کی دوکان کے پچھلے حصے میں  
چھپ کر بیٹھا ہوا تھا۔ اسے لوگوں کے رو برو جاتے ہوئے شرم آتی تھی۔ اس کے  
باوجود آتے جاتے لوگ رضا کی دوکان پر رک جاتے اور ایلی کی منگنی کی بات چھیر  
دیتے۔

## منگنی

”بڑی دھوم سے منگنی کی ہے ہاجرہ نے کیوں نہ ہو جئی اکلوتا بیٹا ہے ماں کی کوئی  
اپنی خواہش آج تک پوری نہیں ہوئی تو اسی بہانے سے۔ مطلب تو خوشی دیکھنا ہے نا  
بھی۔“

اس پر رضانے ہستے ہوئے چھپے ہوئے ایلی کی طرف دیکھا اور بظاہر بڑی سادگی  
سے با آواز بلند کہا ”اور چچا جی لڑکا بھی تو گذری میں لعل ہے۔“

”لیکن وہ چھپا کہاں ہے آج دکھائی نہیں دیتا۔“ چچا مسکرائے۔ ”تمہاری  
دوکان کی گذری میں تو نہیں چھپا ہوا۔“ چچا نے یہ کہتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر پردہ اٹھا  
دیا اور ایلی کو چھپا دیکھ کر ہٹنے لگے۔ ”بھی واہا ایلی تم یہاں چھپے ہو اور محلے میں تمہاری

منگنی کے چہے پے ہیں۔ واہ بھی وہ عجیب معاملہ ہے باپ شادی کا شو قین ہے اور بیٹا منگنی پر شرم کے مارے چھپا ہوا ہے۔“

ایلی کا دل دھک کرنے لگا اور وہ سخت کر پرانے دلوں کے انبار کے پیچے

سرک گیا اور پچھا ہستے ہوئے چل پڑے۔

پھر رضانے شور مچا دیا۔ ”سن لیا گدڑی کے لعل اب چھپی ہی رہو گے کیا۔“ ایلی کا جی چاہتا تھا کہ رضا کو گالیاں دے لیکن گالی دینا اس کے نزدیک جائز نہ تھا۔ وہ گالی دینے کی جرأت نہ رکھتا تھا۔ بہت بڑے جو راز کھول دیتے ہو۔“

وہ غصے میں چلا یا۔

رضانے کے مار کر بہت لگا۔ نشر میاں و میاں راز تو ہوتے ہیں اس لیے کہ انہیں کھولا جائے اور اڑ کیاں ہوتی ہیں اس لیے کہ انہیں پھانسا جائے آج تو تمہیں موجودوں پر تاؤ دے کر چنانچا ہے آج تم۔۔۔ لیکن تمہارے منہ پر موچھ بھی ہو۔“

پھر کوئی محلے والی آنکھی ادھر ہاگیں تو یہاں بیٹھا ہے۔“ اس نے رضا سے کہا۔

”یہاں بیٹھا ہے تو اور تیرے دوست کی منگنی ہو رہی ہے آج تو تیری پانچوں گھنی میں ہوں چاہیں۔“ ”فی الحال تو سر ہی کڑھائی میں ہے۔ اماں۔“ رضانے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”اے ہے۔“ ماں مسکراتے ہوئے بولی۔ ”بات کرنے سے نہ چوکے گا تو۔ ایک رگ زیادہ ہے نا۔ سچ کہا ہے کسی نے لنگڑے کی ایک رگ زیادہ ہوتی ہے۔“

”ایک نہیں ماں یہاں تو کئی زیادہ ہیں۔“ رضانے جواب دیا اور بڑھیا ہاتھ چلاتی آنکھوں سے گھورتی اور ہونٹوں سے مسکراتی چلی گئی۔

پھر ارجمند آ کر چلانے لگا۔ ”ارے لنگڑے کہاں چھپا یا ہے اس گدڑی کے لعل کو نہیں بتائے گا سالے تو دوسرا بھی لنگڑی کر دوں گا۔“

”یہ تو اور بھی اچھا ہے۔ لپٹنے کے لیے لنگڑی لا جواب ہے۔“ رضانے جواب

”یہ پہنچ و پیش سب نکال دوں گا بتا کہاں ہے۔“

”یہیں کہیں ہو گا شرم سے منہ چھپائے ہوئے۔“ رضا نے اشارہ کیا۔

”یہ پہنچ و پیش سب نکال دوں گا بتا کہاں ہے۔“

”اے تو یہاں ہے۔“ ارجمند اندر آ کر بولا۔ ”بس ناس کر دیا تو نے یہ لیبل لگا کے ستیا ناس ہو گیا۔ ایسٹ الجر کی قسم تمہاری اس حرکت نے سارا انکراینڈی ختم کر کے رکھ دیا۔ اب نہ پریم لوٹا کام آئے کانہ پریم سندھیں اور نہ پریم پتر سب بدک کر بھاگ جائیں گی تیرے اس لیبل کو دیکھ رہا۔ دوست تو ہمیں بھی لے ڈوبا آئے کے ساتھ گھن بھی پس گیا۔ چل میں چھپ کے گیوں بیجا ہے۔ چل وہ کپ کیپ اور ہکوری ڈکوری جمع ہیں۔ بھی واہ کیا پھر ہے چل اب پھنس گئی تو پھر کن کیسا۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔“

عین اس وقت جمیل آ گیا۔ ”چلو بھائی۔“ وہ چلا یا۔ ”کیا یاد کرو گے کہ دوست کی منگنی پر کچھ نہ کھلایا۔ آج جو جی چا ہے کھاؤ۔ چلو نگ لگلی کے حلوائی نے تازہ پیڑے بنائے ہیں۔“

”ارجمند کو تو کپ کپ کی لگی ہے۔ چلو ہم تینوں چلتے ہیں۔“ رضا نے شرات سے لنگڑی نانگ کی ہا کی جھلا کر کہا۔

”اچھا بھی اگر پنچوں کی یہی مرضی ہے تو آج کے دن ہم بھی پیڑے کھا کر گزارہ کر لیں گے کیا کیا جائے۔“ ارجمند بولا۔

محوراً ایلی ان کے ساتھ چل پڑا مگر اسے رہ رہ کے خیال آتا کہ اگر کسی نے اسے مٹھائی کھاتے ہوئے دیکھ لیا تو کیا کہیں گے لوگ کہاں پنچنی کی خوشی منارہا ہے۔ بہانہ بنا کر اس نے جست لگائی تاکہ درستے میں وہ اس کانڈا ق ناڑا گئیں۔

ارجمند نہ سا۔ ”بڑی بے صبری ہے بھی آج۔ بیچارے کو کیا معلوم کہ ابھی تو

صرف سیٹ ریز رو ہوئی ہے۔ یشمیں گھڑی تو نصیب سے ملے گی۔“

رضا۔ ارجمند اور جمیل سے کنی کاٹ کروہ چھپتا چھپتا سید حاشریف کے پاس جا پہنچاتا کہ وہاں اطمینان سے بیٹھے سکے۔ شریف اسی طرح منہ میں حقے کی نے لیے چھت کی طرف گھور رہا تھا۔ گھر کے سب افراد کا شوم کے یہاں آقریب منانے کے لیے جا چکے تھے۔ اسی لیے مکان سنمان پڑا تھا۔

”آگئے تم۔“ شریف مسکرا یا۔ ”مجھے معلوم تھا۔ تم آؤ گے۔ ان ظالموں نے تمہیں بھی جکڑ دیا۔ تمہاری قسمت پر بھی مہربشت کر دی۔“ اس نے ایک لمبی آہ بھری۔ ”ان کی خوشی اسی میں ہے کہ لوگوں فی لقدیمیوں سے کھیلیں۔“ ایلی کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ مخفی لرنے میں تقدیر یہ سے کھیلنے کی کیا بات تھی۔

”نہیں۔“ وہ دلبی آواز سے بولا۔ ”ماں نے تو مجھے صرف نامزوں کیا ہے تا کہ ابا اپنے رشتہ داروں کی جھوٹی میں نہ ڈال دیں۔“

”وہ یونہی کہا کرتے ہیں۔ ایلی وہ یونہی کہا کرتے ہیں۔ وہ یونہی بھولے نوجوانوں کو دام میں پھنسایا کرتے ہیں اور تم ان کے دام میں پھنس گئے ہو۔“ ”نہیں۔ نہیں۔“ ایلی چلا یا۔ اسے یہ جان کر صدمہ ہوا کہ شریف اسے بچ سمجھتا ہے۔ ایلی کی خواہش تھی کہ شریف اسے دوست سمجھے اور کھل کر اس سے باقیں کرے۔ اپنی زندگی کے راز بتائے۔ یوں مشورے دے جیسے کہ دوستوں کو دیجے جاتے ہیں۔

”نہیں۔ نہیں۔“ وہ بولا۔ ”ماں نے میرے سامنے ہاتھ جوڑے تھے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔“

شریف قہقهہ مار کر نہس پڑا۔ حقے کی نے اس کے منہ سے نکل کر نیچے گر پڑی۔ ”ماں کے آنسو۔“ وہ ہنسا قصائی کی چھری تو مفت میں بدنام ہے۔ وہ فتح کرتی ہے ایلی مگر اس نے کبھی روپ نہیں بدلا۔ اپنے آپ کو کسی اور شکل میں پیش نہیں کیا۔ لیکن

ماں کے آنسو۔“اس نے دانت بھیجن کر کہا۔“وہ اسی طرح ہاتھ جوڑتی ہیں۔ آنسو بھاتی ہیں اور پھر جب شکار پھنس جاتا ہے تو اس پر سواری کرتی ہیں۔ ماں کے آنسو۔“شریف نے ایک بھی انک قہقہہ لگایا۔

عین اس وقت سعیدہ آگئی۔“ہائیں تو یہاں بیٹھا ہے ایلی۔“وہ چلائی۔“خد اکے واسطے۔“اس نے شریف کے آگے ہاتھ جوڑے خدا کے لیے اب ایلی کی زندگی کو تباہ نہ کر۔ اپنی تو بر باد کر لی۔ اب اس پر حرم کر۔ تجھے میں معلوم خالہ کی تمام امیدیں اور امکنیں ایلی سے واپسیتے ہیں۔“سعیدہ کی آنکھوں میں آنسو آ گھے۔“میری طرف دیکھ۔“شریف نے ایک دیوانہ والر قہقہہ لگایا۔ کہنے لگا۔“ماں کی آرزوں میں پوری ہوں۔ بہنوں کی امکنیں پوری ہوں۔ مگر۔“بات ختم کئے بغیر وہ خاموش ہو گیا اور چھٹت کی طرف گھورے لگا۔

“تم نے اس کی ماں کے آنسو نہیں دیکھے۔“سعیدہ غصے میں چلائی۔

“تمہارے بھی دیکھ رہا ہوں۔“شریف نے مسکرا کر کہا۔“کیا فرق پڑتا ہے۔“

“اُدھر آ ایلی۔“سعیدہ نے ایلی کا بازو پکڑ کر اسے کھینچ لیا۔“جا گھر جا۔ ماں تیرا انتظار کر رہی ہے۔ یہاں بیٹھ کر کیا حاصل ہو گا تجھے۔ جا گھر جا۔“

ایلی چپ چاپ گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اندھیری ڈیوڑھی میں وہ رکا باہر عورتیں باتیں کر رہی تھیں۔

“اچھا ہی کیا چاچا چی ہا جرہ نے جو بیٹی کو ابھی جکڑ لیا ورنہ بڑے ہو کر یہ قابو میں آتے ہیں کیا۔“

“تو بے کر لڑ کی کوئی زمانا آیا ہے۔“

“پر میں کہتی ہوں چھی بات بگڑتی ہو تو بگڑ کر رہتی ہے۔ چاہے جو کر لو آخر اس کے ابا کا بیاہ بھی تو چھٹپٹن میں ہی ہوا تھا۔ ہا جرہ سے۔ اب دیکھ لو اس نے کیا کر دکھایا۔“

”ٹھیک کہتی ہے تو غیب کی بات کون جانے پر میں کہتی ہوں آخر ہے اسی کا پیٹا۔  
یہ کیا کم گل کھلانے گا۔“

ایلی سوچ رہا تھا۔ نہ جانے کوئی بات سچی تھی۔ اماں کے آنسو یا شریف کا قہقہہ۔  
ڈیورٹھی سے نکل کر وہ چکنے سے دادی اماں کے پاس چلا گیا۔ دادی نے اسے  
دیکھ کر تیوری چڑھانے پر

”اے بیٹے کہاں بھکلتا پھرتا ہے تو۔ ادھر تیری ماں اپنا چاول پورا کر رہی ہے۔ آخر  
وہ تمہارا باپ ہے۔ اس کی رضا مندی تو ہوتی تیری ماں ہے۔ رضا مندی نہ کسی  
اس سے بات ہی کی ہوتی آخوندگر کے مرد سے بات کرنی ہی چاہئے تھی۔ ہاجردہ کی یہ  
سینہ زوری تو بے کیا زمانہ آیا ہے۔ یہ وکیوں اعلیٰ احمد کی چٹھی۔ میرے خط کے جواب  
میں کیا لکھا ہے۔ اس نے دادی اماں نے تخت سے چٹھی اٹھا کر اسے دی۔ بولی۔  
”وہ تو لکھتا ہے ہمیں معلوم نہیں کہ ایلی کی ملنگی ہو رہی ہے۔ کہاں ہو رہی ہے۔ ایلی  
کی ماں ہی جانتی ہو گی۔“ وہ اپنی مرضی کر رہا ہے یا اپنی مرضی کر رہی ہے اور تو میرے  
لال تو خواہ تجوہ ان چکلی کے پاؤں میں پسا جا رہا ہے۔ آبیٹھے یہاں میرے پاس۔  
دیکھ تو میں نے تیرے لیے کیا منگوایا ہے۔ غصب خدا کا ادھر علی احمد آنکھیں دکھارہا  
ہے ادھر یہ بی بی آنسو چھال کارہی ہے۔ آ بھی جا ب۔“

یہ پہلا دن تھا جب اس نے محسوس کیا کہ دادی اماں پر پیشان ہے۔ اس کے  
ماشے پر تیوری چڑھی ہوئی تھی۔ ویسے وہ گھورتی تو وہ روز ہی تھی۔ جب محلے کے  
لڑکوں پر گرجتی تھی تو وہ سب بھاگ کر چھپ جایا کرتے تھے۔ مگر ایلی کے لیے گویا وہ  
تیوری محض دکھاوے کی ہوتی تھی۔ تیوری ہونے کے باوجود وہ تیوری تلخی کی حامل نہ  
ہوتی تھی اور ایلی اسے دیکھ کر نہس دیا کرتا تھا لیکن اس روز دادی اماں تیوری  
چڑھانے کے بغیر ہی گھور رہی تھی۔ جیسے اپنے آپ کو گھور رہی ہو۔ اپنی بے بسی پر تملہ  
راہی ہو۔

باہر بینڈنگ رہا تھا۔ دور کلثوم کے گھر میں اڑکیاں ڈھولک پر گیت گارہی تھیں۔  
”الی متحاترا چندور گابودی کنڈلاں والی او۔“

ایلی کی منسوبہ شرہ اس کی خالہ زاد بہن کلثوم کی اڑکی تھی۔ کلثوم کے گھروہ اکثر جایا کرتا تھا اور دیر تک وہاں بیٹھ کر باتیں کیا رہتا تھا۔ اس دوران کئی بار شرہ بھی وہاں آتی یا ادھر ادھر کام میں مصروف رہتی۔ اس کے باوجود وہاں سے شرہ کی شکل و صورت کے متعلق سچھانہ ازہ نہ تھا۔ ملکنی کے روز ایلی نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ اس نے شرہ کو کبھی دیکھا ہی نہیں۔ اس کے دل میں آرزو پیدا ہوئی کہ شرہ کو غور سے دیکھے۔ کیسی ہے۔ لیکن کسی کے ہمراج کر لائیں کو غور سے دیکھنا ایلی کے لیے ممکن نہ تھا۔ اسے نگاہ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہ ہوتی تھی اور لڑکیاں جسی تو عجیب ہوتی ہیں پاس جا کر دیکھو تو یوں چزی سنبھال کر بیٹھ جاتی ہیں جیسے بے جان لڑکیاں ہوں۔ دور سے کھڑکی میں کھڑے ہو کر دیکھو تو سورنسیوں کی طرح دم پھیلا پھیلا کرنا چلتی ہیں۔ چڑیوں کی طرح چھد کتی ہیں۔ دور سے دیکھنے میں کس قدر لطف آتا تھا۔ لیکن قریب سے اب تو شرہ کو قریب سے دیکھنا بالکل ہی ممکن نہ تھا۔ اب تو اس گھر میں پاؤں دھرنے بھی مشکل تھا۔

ایلی کی نظر میں کلثوم کے گھر کے مناظر یوں چلنے لگے جیسے فلم چلتی ہے۔ دم پھیلا کرنا چلتی ہوئی شرہ سرخی اور پاؤڑر سے تھپے ہوئے چہرے والی کلثوم جس کے گلے میں پھولوں کے ہار لٹکا کرتے تھے اور مر جھائے ہوئے چہرے والا رحم علی جو کلثوم کا خاوہ تھا۔ جسے دیکھ کر محسوس ہوتا تھا۔ جیسے وہ مظلوم ہو۔ جیسے وہ کلثوم کامیاں نہیں بلکہ نوکر ہو۔ دفعاً ایلی کی نگاہوں تلے روغنی چہرے والی شرہ گلے میں ہارڈا لے آ کر چوکی پر بیٹھ گئی۔ اس کے اپنے چہرے میں تبدیلی رونما ہوئی۔ گال پچک گئے منہ پر جھریاں پڑ گئیں اور صورت رحم علی کی سی ہو گئی اور وہ شرہ کی چوکی کے قریب یوں جا کر کھڑا ہوا جیسے رحم علی ہو۔ ایک مظلوم فرد، نوکر، ایلی چوکا اور گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔

”کیا ہے تجھے۔“ دادی اماں چالائی۔ ”انتا بے قرار کیوں ہے تو۔ لیٹ جا آرام

سے۔ لیٹ جا۔“

پھر ایلی کی نگاہوں تلنے پچاہنے لگے۔ ”بڑی دھوم سے مغلنی کی ہے ہاجرہ نے۔“  
”ستیا ناس کر دیا۔ سواستیا ناس۔“ ارجمند چلایا۔ ”لیپیل لگا کے کیوں مری مٹی  
خراب کی۔ ساری انکراینڈی ملیا میرٹ ہو گئی۔“  
پھر ہاجرہ اس کے رو برو آ کھڑی ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ”میری  
عزت تیرے با تھنے ہے۔“

”اچھا کیا جھٹپٹیں میں ہی حکڑیا۔“ ایک عورت بولی۔  
ماں کے آنسو بیانیا۔ شریف کا قہقہہ ستائی دیا۔ ماں کے آنسو وہ رُٹپ کر اٹھ  
بیٹھا۔

”کچھ بھی نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں۔“ شادی اماں نے گویا شریف کی ہاں میں ہاں  
ملادی۔ ”کیا ہے تجھے۔“ وہ بولی۔  
دور کر کیاں گارہی تھیں۔ ”بیٹھی ہنجواں دے ہار پرواں۔“

## تحلیل میں مینڈک

اگلے روز ہاجرہ ایلی کو اکیلے میں لے گئی۔ کہنے لگی۔ ”شریف کی باتوں میں نہ آنا  
ایلی وہ تو خواہ مخواہ تجھے گراہ کر رہا ہے۔ لوگوں بات ہے بڑا اپدیشک دیکھلو۔ شادی  
کے خلاف پر چارکرتا ہے۔ بھلا خود کیوں اپنی شادی کروار رہا ہے۔ سعیدہ سے ملتیں  
کیوں کرتا ہے۔ کیوں اس کے سامنے با تھجھوڑتا ہے۔“

”با تھجھوڑتا ہے؟“ ایلی نے حیرانی سے پوچھا۔ ”وہ کس لئے؟“

”کہتا ہے میرا بیاہ کر دو۔ میں اپنا گھر بساوں گا۔ دیکھلو۔ خود تو اتنا چاؤ ہے دوسرا  
بیاہ کرے گا اور تمہیں مغلنی کے خلاف اکسار رہا ہے۔ تو بے کوئی حد ہوتی ہے زمانہ سازی  
کی۔“

زمانہ سازی اور شریف۔ ایلی کو یقین نہیں آ رہا تھا ”نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔“

نہیں ہو سکتا۔“ وہ اٹھ بیٹھا ”خوبیں اماں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ وہ چلایا۔ ”پوچھ دیکھ تو اس سے۔“ ہاجرہ چمک کر بولی۔ ”میں کیا غلط کہہ رہی ہوں۔“

ہاجرہ کے جانے کے بعد وہ سید حاشریف کے گھر پہنچا اور جاتے ہی بات چھیڑ دی۔“ آپ کی شادی ہو رہی ہے کیا؟ ”اس نے شریف سے پوچھا۔

شریف کے ہونٹوں پر زہر خند پھیل گیا چھت کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے آہ بھری۔“ شادی ” وہ ہنسنے لگا۔ عجیب سی نسیخی وہ اس میں سرت کی بجائے دھمکی تھی خوفناک دھمکی جیسے وہ شادی کی بجائے انتقام لے رہا ہوا اس کے قبیلے میں ایک تسلسل پیدا ہوتا گیا خوفناک تسلسل اور آواز بیندرانج باند ہوتی گئی۔ اس قدر باند ہو گئی کہر کے سب لوگ بھاگ کر اس کے گرد جمع ہو گئے۔“ کیا ہوا۔ کیا بات ہے۔ ” مگر شریف کسی کو جواب دیئے بغیر اسی طرح قبیلہ مار کر بننے جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا تھا۔ منہ سے رال کے تار نکل رہے تھے۔ چہرہ اسرخ ہو گیا تھا۔

“ اب کیا محلے والوں کو تم اشاد کھانا ہے۔ ” سعیدہ چلا می۔“ یا کوئی نیا کھیل ہے۔ ” اللہ رکھے اگلے ہفتے برات لے کے جانا ہے۔ بہن شادی کی خوشی ہے نہ لیئے دو۔“ رابعہ نے بات نالنے کو کہا اور پھر ایلی کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔“ آج تھے دکھاؤں کیسے اچھے کپڑے بنوائے ہیں اس کی دہن کے لیے۔“ وہ گھیٹ کر ایلی کو دوسرا کمرے میں لے گئی۔

“ لیکن خالہ۔ ” اس نے رابعہ اور سعیدہ سے پوچھا۔“ کہاں ہو رہی ہے شریف کی شادی؟ ”

“ بہت دور۔ ” رابعہ نے کہا۔“ بہت دور جہاں وہ نوکر ہے وہاں نہ جانے کیا نام ہے اس جگہ کا۔ ”

“ مگر بہن۔ ” سعیدہ نے کہا۔“ ہم تو وہ خرم آباد کے رہنے والے نوکری نور پور

میں کرتے ہیں ناٹرکی کے ابا بہت بڑے افسر ہیں۔ غلام علی نام ہے۔ ”وسرے کمرے میں شریف کا قبضہ ختم ہو چکا تھا اور اب وہ کھانس رہا تھا جیسے تھک کر ہار گیا

- ۶۰ -

”دیکھا۔“ رابعہ نے زیرِ لباس مسکرا کر کہا۔ ”کیلئے میں سب ٹھیک ہو گیا۔ اب وہ کھانس رہا ہے تم تو، ہن اس کی دیوانگی کو اور بھی ہوادیتی ہو۔“

”لو مجھے کیا معلوم کہ ایسی ہوتی ہیں یہ باتیں۔“ سعیدہ بوالی۔ ”میں ذرا جا کر دیکھوں۔“ ایلی نے دبی زبان سے کہا اور پھر چپکے سے شریف کے پاس جا بیٹھا۔  
شریف آنکھیں موندے ہیں لگائے چپ چاپ بیٹھا تھا۔

پھر وفا اس کی نگاہ ایلی پر پڑی۔ ہوتیں پتیں ہم لہرایا۔ ”شادی“ وہ مدھم آواز میں بولا۔ اب شادی کیا ہوگی۔ جب شادی کی آرزو تھی۔ تب تو یہ سب میرے راستے میں دیوار بن کر کھڑے ہو گئے تھے۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ انور اور شریف کی شادی ہو سکتی نہیں ہو سکتی۔ طالموں نے مجھے قید کر لیا اور اسے شہر سے دور نہ جانے کہا لے گئے۔ اب کیا ہے۔ ”اس نے لمبی آہ بھری۔“ یہ سمجھتے ہیں میں شادی کر رہا ہوں۔ ان کو کیا معلوم ایلی۔ ان میں احساس نہیں۔ یہ کیا سمجھیں گے۔ ”پھر وہ ایلی کے قریب تر ہو گیا اور رازدارانہ انداز میں بولا۔ ”انہیں نہیں معلوم ایلی کہ میں صرف اس لیے شادی کر رہا ہوں کہ اس کا دل نہ ٹوٹے۔ اس کی زندگی تباہ نہ ہو۔ جیسے میری زندگی تباہ ہوئی تھی اور وہ کتنی معصوم ہے تم دیکھو گے تو اندازہ ہو گا تمہیں اس بیچاری کو کیا معلوم کہ محبت کے کہتے ہیں۔“ شریف نے جھر جھری لی۔ ”نہ جانے اسے کیا نظر آیا ہے مجھ میں۔ نہ جانے اسے کیا خوش نہیں ہے۔ کاش وہ کسی جیتے جا گتے نوجوان کو چلتی۔ مجھا یے مردہ شخص میں اب کیا رہ گیا ہے۔ جو تھا وہ لوگوں کے ظلم کی بحیث چڑھ گیا۔ اب کیا دھرا ہے۔ لیکن اسے کون سمجھائے۔ جو بھی دلیز پر کھڑی مسکرا رہی ہوا سے کیا معلوم کہ زندگی کیا چیز ہے۔ نہ جانے محبت نے اس پر کیا جادو کر دیا ہے۔

واقعی ہی وہ شہزادی ہے۔ اسم بائسکی ہے۔ مجھے چھپ چھپ کر دیکھنے کے بعد ایک روز وہ مکان کی دلیز سے باہر آگئی۔ میرے روپرو اور اس نے ایک مینڈک کے ذریعہ اظہار محبت کر دیا۔“

”مینڈک کے ذریعے محبت“ ایسا نہیں تھا سے پوچھا۔

”ہاں مینڈک کے ذریعہ اظہار محبت۔“ شریف ہنسنے لگا۔ ”اس نے مینڈک کو ایک چھلی میں اسی رکھا تھا جب میں سورا تھا تو اس نے وہ چھلی مجھ پر پھینک دی۔ میں ڈر کر اٹھ بیٹھا وہ ہنسنے لگی۔“ شریف نے ہنسنے ہوئے کہا۔ ”محبت بھی اظہار کے انوکھے طریقے پیدا ہوتی ہے۔ انوکھے۔“ وہ رنگ لگایا اور طویل خاموشی کے بعد بولا۔ ”مجھے اس کی محبت کا انتظام ہے اسے تو شاید میں ٹھکرا دوں۔ مگر محبت کو کیسے ٹھکرا سکتا ہوں۔ میں نے خود محبت کی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ محبت کیا ہوتی ہے۔ عجیب چیز ہے محبت۔ عجیب، تم محبت کرو ایسی۔ کسی سے کرو مگر محبت کرو۔“ اس نے ایک طویل آہ بھری اور خاموش ہو گیا۔

آٹھ روز کے بعد وہ سب برات لے کر نور پور جا رہے تھے۔ اس انوکھی لڑکی کو دوہن بنا کے لانے کیلئے جس میں اتنی جرأت تھی کہ گھر کی دلیز سے باہر نکل کر شریف پر مینڈک پھینک سکتی تھی۔ وہ لڑکی جسے ایسا انوکھا اظہار محبت سوچھ سکتا تھا۔

محلے میں تو ایک بھی لڑکی ایسی نہ تھی جس میں مذاق کرنے کی صلاحیت ہو یا جس میں جرأت ہو۔ انہیں تو دبے پاؤں چلنے۔ چھپ چھپ کر جھانکنے اور منہ پر پلو لے کر مسکرانے کے سوا کچھ نہ آتا تھا۔

لڑکے چوگان میں کھڑے ہو کر رشمیں رومال ہلاتے ہلاتے اور بال ٹھیک کرنے کے بہانے سلام کرتے کرتے تھک جاتے مگر وہ یوں بے حس و حرکت کھڑی رہتیں۔ جیسے پتھر کی بنی ہوئی ہوں چند ایک جن پر محلے کا اثر زیادہ نہ تھا لڑکوں کو دیکھ کر دوڑتیں بھاگتیں۔ ایک دوسرا کو پکڑتیں۔ پلو چھلکتیں۔ اسے سنجھاتیں۔ بھی کچھ کرتیں

شورنہ تھا۔

مگر انہار محبت کرنا تو کیا انہیں پیغامات محبت کو مناسب طور پر وصول کرنے تک کا

جس دن سے شریف نے ایلی کو اپناراز بتایا تھا اسی دن سے بیٹھے بٹھائے ایلی کی نگاہوں نے ایک شوخ متبعسم حسینہ آکھڑی ہوتی۔ اس کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکراتی اور ایلی کا جی چاہتا کہ وہ دلیز سے باہر نکل آئے اور پھر تھیلی میں سلا ہوا مینڈک دھپ سے اس کے سینے پر آگرے اور وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھے اور فضا میں ایک مدھم مگر رنگیں قہقہے یون لوچ جیسے لکھنیاں نج رہی ہوں۔

اس روز برات کے ساتھ فوراً پور جاتے ہوئے وہ غیر معمولی طور پر خاموش تھا۔ کھڑکی سے باہر نیالے ٹیکے روز برات ہے تھے۔ بھائی کوئی گھر لا کھد منہ چھاڑے آ لکھتا جس کے تلے دور پانی کی نندی ناچی۔ پھر وہی ٹیکے اور ان پر یہاں وہاں خشک ٹھہر مٹھہ درخت۔ ایلی کی نگاہیں اس گلابی افق میں کھوئی ہوئیں تھیں جو اس کے اندازے کے مطابق ان کی منزل تھا اور وہاں گلابی متبعسم چہرہ اسے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

ڈبے میں بیٹھے ہوئے براتی اپنی باتوں میں ملکن تھے۔ ہر چند منٹ کے بعد ایک قہقہہ گونجتا۔ کسی پر آوازہ کساجاتا اور ایلی چونک کرا دھر دیکھتا۔

ایک طرف محلے کے بزرگ تھے دوسری طرف جوان اور تیسرا طرف اس کے اپنے ساتھی۔ ارجمند، رضا اور رفیق۔ ہر گروہ اپنے اپنے مشاصل میں منہمک تھا۔ صرف دو فردا کیلئے چپ چاپ بیٹھے تھے۔ ایک کونے میں شریف تھا جو مسلسل گاڑی کی چھت کو گھوڑے جا رہا تھا۔ دوسری طرف ایلی تھا۔ جو کھڑکی سے باہر کسی رنگیں افق کو دیکھنے میں کھویا ہوا تھا۔ ممکن ہے۔ ریل کی چھت میں شریف بھی وہی رنگیں افق دیکھ رہا ہو۔ ان دونوں کو منزل کا خیال لگا ہوا تھا۔ دونوں کے سینوں میں مینڈک کو در ہے تھے دونوں کی نگاہوں میں رنگیں تبعسم جھلماڑا رہے تھے۔

ہر چند منٹ کے بعد غالباً اپنے خیل اور محسوسات کی نوعیت سمجھ کر ایلی احساس

ندامت سے گھبرا جاتا۔ اس خیال پر ندامت محسوس کرتا کہ اپنے دوست کی بیوی کو تاک رہا ہے۔ محسوس کرتا کہ وہ مجرم ہے پھر گھبرا کر لا جوں پڑھتا اور کسی اور بات کی طرف متوجہ ہونے کی ناکام کوشش کرتا۔ پھر دفعتاً اس کے چیل میں شہزادی پیچھے ہٹ جاتی اور اس کی چھوٹی بہن آگے پڑھتی۔ شاید اس میں بھی دلیز پار کرنے کی جرأت ہو۔ شاید اسے بھی مینڈک چھیننے سے لجپی ہو۔ اس خیال پر وہ اطمینان کا سائز لیتا اور پھر سے اپنے نگین خواب میں ہو جاتا۔

ایلی کے ذہن میں ایک نئی امید کروٹ لے رہی تھی۔ ایک نئی دنیا ابھر رہی تھی۔ دور سامنے ٹیکے کی اوٹ میں مینڈکوں کی چیل کے کتارے ایک دو شیزہ اسے دیکھ کر مسکراتی اسے اشارہ کرتی۔ ایلی کے جسم پر چیل نیاں زیستیں سینے میں مینڈک پھد کتے اور دل میں نہ جانے کیا کیا ہوتا۔

شریف بھی بار بار چونکتا جیسے وہ بھی خود کو مجرم سمجھ رہا ہو۔ جب وہ اس نگین منزول کے خیال میں کھویا ہوا ہوتا تو ایک سو گوار چہرہ اس کے روپ و آکھڑا ہوتا۔ ستا ہوا منہ کھلے پر یشان۔ ہونٹوں پر زہر خند۔ اسے دیکھ کر شریف کو احساس ہوتا کہ وہ انور سے بے وقاری کر رہا ہے۔ انور کی زندگی تباہ کر کے خود نگین افق آباد کر رہا ہے۔ اس خیال پر وہ گھبرا جاتا۔ پھر اس کی آنکھوں میں حزن و ملال کی گھٹائیں ابھرنے لگتیں دل سے آواز بلند ہوتی۔ نہیں نہیں میرا کیا ہے۔ یہ سب تو اس لیے ہے کہ اس کا دل نہ ٹوٹے۔ اس کی زندگی تباہ نہ ہو۔

براتی دو لہماں کی حالت کو دیکھ کر مسکراتے۔

”دیکھ لو بھئی یہ دو لہماں ہیں یوں اپنی برات لئے جا رہے ہیں۔ جیسے کوئی دار پر چڑھ رہا ہو۔“

علی احمد قہقہہ لگاتے۔ ”جبھی تو علی احمد دار پر چڑھتے چڑھتے نہیں تھکتے۔“

نو جوان چھپ چھپ کر مسکراتے سر گوشیاں کرتے اور پھر ارجمند با آواز بلند

کہتا۔ ”میاں ایلی تم تو یوں بیٹھے ہو جیسے کوئی دار پر چڑھنے والا ہو۔“

”کیوں میاں اسے شوق نہیں کیا۔ پیٹا کس کا ہے۔“

اور سب علی احمد کی طرف دیکھ کر رہتے اور گاڑی چھینتی چلاتی ہوئی دوڑے جاتی۔

بالآخر ایک وسیع و عریض پلیٹ فارم پر گاڑی رک گئی۔ ”لوبھی نور پور آگیا۔“

کوئی چلا یا ایلی کا دل اچھل کر حلق میں آپھسا۔

وہ ایک عجیب سائشین تھا۔ جیسے ایک وسیع و عریض ریس کورس ہو۔ پلیٹ فارموں کی چورائی اور لمبائی عام پلیٹ فارموں سے کئی گناہ زیادہ تھی۔ سائشین کے احاطے کے چاروں طرف قدر آدم فصل تھی۔ جس میں ایک پھانک لگا تھا۔ جس سے ریل اندر داخل ہوتی ایک طرف سرخ رنگ کا ایک اونچا قلعہ بننا ہوا تھا جس کی دیواروں میں بندوق کی نالیوں کے لیے سوراخ چھوڑے ہوئے تھے۔ دوسری جانب سائشین کے ساف کے رہائش کو اور ٹرستھے۔ بیٹھے بیٹھے سے معمولی کوارٹر اور قلعہ کے پیچھے اونچے سیاہ پہاڑ ایستادہ تھے۔

ایلی نے تعجب سے چاروں طرف دیکھا۔ پھر اس کی نگاہیں ان کوارٹروں کی طرف مرکوز ہو گئیں۔ اسے ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے کھڑکیوں اور دروازوں کے پیچھے مینڈ کوں سے بھری ہوئی تھیلیاں رکھی ہوں۔

باہر سائشین کے احاطے میں کوئی ایسی جگہ نہ تھی جہاں سے مینڈ ک دستیاب ہو سکتے ہوں۔ مینڈ ک کیا وہاں تو تالاب یا چھپڑ کا نام دنشان تک نہ تھا۔

پھر وہ ایک بہت بڑے کمرے میں کھانا کھا رہے تھے۔ قسم قسم کے چاول اور گوشت۔ وہ حیرانی سے ان مرغ مسلم رکابیوں میں پڑے تھے۔ محلے والوں کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں اور شہزاد کے والد کی آنکھوں میں پھل بھڑیاں چل رہی تھیں۔

”کیا جوڑی ہے۔“ چھپا چلانے لگے۔ ”بھائی غلام علی اور علی احمد کی واہوا۔“  
”وہ کہتے ہیں نا۔“ کسی نے آوازہ کسا ”ساجن سے ساجن ملے کر کر لبے  
ہاتھ۔“

”بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر بھائی غلام علی۔“ علی احمد نے اور پھر مسلم مرغ  
پر پل پڑے۔

پھر ایک نوکری آ کر چلانے لگی۔ ”ایلی کو اندر بلایا ہے۔“ اندر بلا رہے ہیں ایلی  
کو۔ ایلی کو اندر بلایا ہے۔ چاروں طرف سے آوازیں بناتی دیتے گئیں۔ ایک  
بھیا نک دف بجتے گئی۔ ایلی کی رگوں میں کوئی دمکتی بجانے لگا زگا ہوں میں اردو گردی  
چیزیں دھندا گئیں۔ 2002-2006ء

اندر جاتے ہی نہ جانے اسے کیا ہوا اس کی آنکھیں جھک گئیں۔ حلق آواز سے  
خالی ہو گیا۔ بازو لٹکنے لگے۔ چاروں طرف سے بخوبی نہ سنائی دے رہی تھی مگر  
وہ گردن شاٹھا سکتا تھا۔ ”اپنے علی احمد کا ایلی ہے،“ محلے والی کی مکروہ آواز سنائی دی۔  
”اچھا بہن جیتا رہے۔“ دو بڑے بڑے ہاتھوں نے اس کے سر کو گرفت میں  
لے لیا اور پھر وہ بھاگا۔

نہ جانے ایسا کیوں ہوتا تھا۔ کیوں جب وہ منزل پر پہنچتا تو اس کے پاؤں میں  
چلنے کی سخت نہ رہتی۔ اس کے بازو شل ہو جاتے۔ لگا ہیں احساس ندامت سے  
دھندا جاتیں۔ ایسا کیوں تھا۔ پھر جب وہ تخلیے میں اپنے تخلی کی دنیا میں واپس  
پہنچتا تو اندھے کی طرح منزل سے چھٹ جاتا۔ اس کی گرفت میں دیوالی کا غصر پیدا  
ہو جاتا تھا۔

## مونگیا گٹھڑی

پھر وہ نور پور سے واپس آ رہے تھے اور ایلی احساس ناکامی کی وجہ سے خاموش  
تھا۔ اس کے تخلی کے پر گویا کٹ چکے تھے۔ بازوؤں میں طاقت پرواز نہ رہی تھی۔

اس کے سامنے کوئی افق نہ تھا۔ میاں لے ٹیکے۔ ٹنڈ منڈ درخت اور پھیلی ہوئی ویرانی۔ پھر ارجمند اسے چھوڑ رہا۔ ”ابے اور دے۔“ وہ چلا یا۔ ”تو پہلے ہی فوت ہو گیا۔ اچھا ہوا۔ ورنہ آج ہماری طرح حرام موت مرتا نجیگیا یا۔ تو ہمیشہ ہی نجیج جاتا ہے۔“

ارجمند کی بات سن لڑائی حیران ہوا۔ ارجمند نے تو کبھی ایسی بات نہ کی تھی۔ اس کے انداز میں کبھی نایوسی نہ دیکھی تھی۔ پھر اسے کیا ہوا۔ وہ یوں سر کو ہاتھ سے قائم بیٹھا تھا۔ جیسے قطعی طور پر بتاہ ہو چکا ہو۔ ”پیٹا ہمارا تو کلیاں ہو گیا۔“ ہودی آوازیں بولنا۔ ”آخر بات کیا ہے۔“ ایسی نیچوچھا بات۔ ”بات۔“ ارجمند نہ سارے دیکھ لوریت کی آنکھوں میں۔ دیکھ لو وہ بات۔ دیکھ لو کیا بنتا ہم پر۔ یا رہم اس لائق تو نہ تھے۔“ ایسی نے رفیق کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں گویا بیر بھوٹیاں رینگ رہی تھیں۔

”ہے ہے۔“ ارجمند بولا۔ ”بس سمجھ لو وہ مظہر جو کپ نے چھ سال کے بعد چھلک کر دکھانا تھا آج دیکھ لیا ہے میں کیا کروں۔“ اس نے لمبی آہ بھری۔ ”اب تو یہی ہے کہ چوہے کی طرح اس نکلے کو کترتے رہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے جیب سے سوکھے ہوئے کیک کا ایک نکٹرا نکالا اور اسے کترنے لگا۔ پھر ایسی کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔ ”ہے ہے تو دوں تجھے پیٹا مگر جوڑاں سے توڑ کر کھانے میں بات ہے وہ کہاں اور پھر اپن کے یہ ہاتھ بھی دیکھ لے جیسے کوہڑی کے ہوں اور وہ ہاتھ جن سے اس بھکاری کو یہ نکٹرا ملا ہے۔ ہے ہے۔ اچھا چل تو بھی کرے دیوی کے درشن۔ کیا چیز ہے خدا کی قسم۔ آ تو بھی کیا یاد کرے گا۔“ وہ اسے گھیٹ کر ڈبے سے باہر لے گیا اور پھر ماحقا زمانے ڈبے میں اسے زرد تیڑھوں کر چلانے لگا۔ ”یہ آیا ہے ایسی خالہ سعیدہ کہتا ہے میں خالہ سے ملوں گا۔“

”آیلی“ خالہ بڑے تپاک سے بولی۔ ”میں تو کب سے تیرا انتظار کر رہی تھی۔ یا ایلی ہے۔ میری خالہ ہاجرہ کا بیٹا۔“ اس نے مونگیا گھڑی سے کہا جو پاس ہی سیٹ پر دھری تھی۔

مونگیا گھڑی میں جنبش ہوئی وہ سفید خون میں بھیکے ہوئے ہاتھ ایلی کی طرف لپکے۔ تازہ خون کی بوکا ایک ریلہ آیا۔ ایلی بھاگنے کی سوچ رہا تھا کہ گھڑی کے پٹ کھل گئے۔ وہ گلابی چھلیں چھلکیں جن میں سیاہ گلاب ابھر رہے تھے۔ سارے منہ پر مٹلی بیبر بہو بیان ریگ رہی تھیں۔ پھر ایک چھلکا ہوا تبسم۔ ایلی کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔

سعیدہ نہ جانے ہاتھ بہار کیا۔ ابھر رہی تھی۔ باہر پیٹ فارم پر ارجمند آنکھ بچا کر چھاتی پیٹ رہا تھا۔ رفتق تیسمیں رومال بہار رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بوندا باندی ہو رہی تھی۔ پرے علی احمد حسب دستور کو اہوں پر ہاتھ رکھ کے ڈبے پر نگاہیں گاڑے کھڑے تھے جیسے کوئی چیل پر تول رہی ہو۔ ان کے قریب ہی صدر انگلیوں میں سگریٹ تھامے چکلی بجا بجا کر گلزار رہا تھا۔ ”اے دل ربا میں ہوں فدا۔“ ایلی خاموش کھڑا تھا۔ نہ جانے کب تک ویسے ہی کھڑا رہا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ کب مونگیا گھڑے کے پٹ بند ہوئے۔

پھر اسے کچھ پتہ نہ تھا کہ کھڑکی کے باہر ٹیلے بھاگ رہے تھے۔ یا سر بزر میدان پھیلے ہوئے تھے۔ اسے معلوم نہ تھا کہ لوگ باقیں کر رہے ہیں یا نہ رہے ہیں۔ دل میں ایک شور برپا تھا۔ رگوں میں اہریں اٹھ رہی تھیں۔ سینے میں دھنکی بخ رہی تھی۔ سامنے ایک لق ودق ویرانہ پھیلا ہوا تھا اور اس ویرانے میں ایک مونگیا گھڑی پڑی تھی۔ اور وہ خون آلو دہا تھا۔ اور گاڑی ہونکی ہوئی جا رہی تھی۔

## شہزاد

محلے میں شہزاد کی آمد یوں اثر انداز ہوئی جیسے جو ہڑ میں پتھر گرتا ہے۔ محلے کے

بند پانی میں چاروں طرف چھینٹے اڑے جیسے سوڑے میں کسی نے نمک کی چلکی ڈال دی ہو۔ پھر ہریں جو ہڑ کے طول و عرض تک ڈوڑ گئیں۔

عورتوں نے اسے دیکھا اور ہنپوں پر انگلیاں رکھ کر خاموش ہو گئیں۔ بوڑھوں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ مردوں کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ بوڑھے اسے دیکھ کر چپ چاپ مسجد کی طرف چل پڑے اور وہاں جا کر سبحان اللہ کا ورد کرنے لگے۔

محلے کے بڑوں میں صرف دو رنگیے آدمی تھے جو عمر میں بڑے ہونے کے باوجود شوقین مزان تھے اور زندگی یہاں ہریں پیدا کر رہے تھے۔ علی احمد اور محمد اعظم، انہیں لا حول پڑھنے لگرہن بھکانے لہانے یا مسجد میں جا کر سبحان اللہ کا ورد کرنے سے قطعاً دچپی نہ تھی۔ منہ سے گنتائے کی بجائے سبحان اللہ، ان کی آنکھوں میں منعکس ہو جاتا۔ جھجک کر پیچھے ہٹ جانے کی بجائے وہ آگے بڑھ کر کوئی بات چھیڑ دیتے۔

”لڑکی تو اوس تو نہیں ہو گئی یہاں آ کر۔“ محمد اعظم مسکراتے۔ ”گھبرا نہیں دل لگ جائے گا۔“ اور پھر ان کی نگاہوں سے ظاہر ہوتا کہ دل لگ کر سب ٹھیک ہو گیا ہے۔

صح سویرے ہی محمد اعظم آ پہنچتے۔ ”کیوں شہزاد کچھ پکانے کھانے کا بھی فکر ہے یا نہیں۔ خالی خولی شہزادگی نہیں چلے گی یہاں، بول کیا منگوانا ہے بازار سے۔ ہائیں بینگن کھائے گی۔ آج پھر بینگن اونہوں بینگن نہیں کھایا کرتے گرمی ہو جاتی ہے۔ اچھا شریف کو کھائے گی بینگن۔ لیکن اس طرح کب تک گزارہ ہو گا۔“ اور وہ قہقهہ مار کر ہستے۔ ”اچھا چائے کا پیالہ تو پلا ایک سو دا کمیشن او کرنے کے بغیر نہیں لایا جاتا۔“ بھگی، ہائیں تو روک باندھ پیتی ہے۔ اونہوں لڑکی چائے پیٹن کی۔“ اور ان کی مختبرم نگاہیں کسی نگلیں پیالی سے لپٹ جاتیں اور انداز سے معلوم ہوتا جیسے بینگن کھا کے

آئے ہوں۔

محمد اعظم کا طریق کا گھر یلو انداز کا حامل تھا۔ ان کی باتوں میں اپنا لینے کا پہلو  
واضح ہوتا۔ بات کر کے پہلو بدلتے۔ پہلو بدلتے اور اس دوران میں نگاہوں سے جانچتے۔ اکسانتے علی احمد چل کر جانے کے قائل نہ تھے نہ انہیں  
سودا لا کر دینے کی بات پسند نہیں اور نہ ہی وہ چائے کا پیالہ مانگنے کے قائل تھے۔ ان  
کی باتوں میں اشاریت کا پہلو ہوتا تھا۔ وہ دوڑ کھڑے پہنچتے تو چیل کی طرح  
منڈلاتے پھر آواز دیتے۔ باتوں سے رجھاتے اور تمام تر بات زبان کی مدد کے بغیر  
نگاہوں ہی میں طے کر لیتے اور بالآخر بر تکمیلِ تذکرہ آواز دیتے۔ ”میں نے کہا  
چاچی۔ ابھی آ جائیں گے پیچا۔ مجددی میں گئے ہیں تو یوں پریشان ہو رہی  
ہے۔“ اور جب چاچی نہیں کر جھاڑ جھپٹ کرتی تو کہتے میں نے کہا۔ یہ شریف کے  
گھر کی کھڑی میں کون کھڑی ہے۔ کوئی انگھی بھری معلوم ہوتی ہے۔ سلام نہ دعاء  
بات نہ چیت۔ اچھا تو تو ہے شہزاد میں سمجھا شاید اندر گیس جلا رکھا ہے۔ تو آئی نہیں  
کبھی۔ دکھائی ہی نہیں دیتی۔ نہ جانے کن مشاغل میں کھوئی رہتی ہے۔“

علی احمد شہزاد کی آواز سنتے تو شیم کے چوبارے سے ماحقہ جنگلے میں نکل آتے اور  
شیم کو یوں آواز دیتے جیسے شیم سے بے حد ضروری کام پڑ گیا ہو۔ جب سے شہزاد  
نے محلے میں قدم رکھا تھا علی احمد کو بار بار شیم سے کام پڑ رہا تھا۔ گھر کے تمام لوگ ان  
کے اس ضروری کام کی نوعیت سے واقف تھے۔ ایسے وقت سعیدہ گھننوں میں منہ  
دوے کر رہتی۔ دادی اماں مسکرا کر رہتی۔ ”تو بے اس لڑکے کو تو اپنی سدھ بدھ نہیں  
رہتی۔“ شیم چوبارے میں ان کی آوازیں سنتی اور تیوری چڑھا کر اپنے آپ سے  
کہتی۔ ”میں جانتی ہوں ان کے ضروری کام کو اچھی طرح معلوم ہے مجھے۔ کون نہیں  
جانتا۔“ شہزاد جنگلے کے سامنے کھڑی ہوتی تو فوراً اسے آواز دیتے۔ ”شہزاد ہے۔“  
وہ جنگلے سے چلاتے۔ ”سنا کیا حال ہے۔ نور پور تو نہیں یاد آتا۔ کھلے میدانوں میں

کلیلیں کرنے والیاں جب گھر میں قید ہو جاتی ہیں تو جی گھبرا تا ہے نا۔ ہی ہی ہی۔  
اور وہ اپنی بات پر ہنسنے لگتے اور دریٹک ہنسے جاتے۔

شہزادوں کی کھدر اپنے کھدے ہونے بازو کو بھول جاتا۔ اسے بال جھک کر سر ہلانا بھی یاد نہ رہتا اور اپنا محبوب گیت حافظا خدا تمہارا، جو وہ پارسی کڑکی کے ساتھ سمع پر گایا کرتا تھا قطعی طور پر بھول جاتا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے میں کھو جاتا۔

محلے کے جوان تو شہزادوں کی کھیران رہ گئے تھے۔ اس کی ہر بات زالی معلوم ہوتی تھی۔ اس کا انداز بننے کا عداؤ کھاتا۔ پعنگی آڑ میں کھڑی ہونے کی بجائے وہ پچن کو لپیٹ دیتی اور چھپ کر دیکھنے کی بجائے اطمینان سے کھڑکی کے زیریں سہارے پر پاؤں رکھ کے بے تکلفی سے ادھر ادھر دیکھتی۔ وہ محلے والیوں کی طرح میلے اور سادہ کپڑے پہننا پسند نہ کرتی تھی۔ اس کا دو پہنچ اعلانیہ شانوں پر گرار ہتا۔ جیسے وہ سر کی جگہ شانوں سے متعلقہ لباس ہو۔ اس کے بال نیم کھلے رہتے اور آنکھوں کے کنوں میں وو رکنپیٹوں تک سر میں کی وحار صاف دکھائی دیتی۔

رفیق اسے دیکھ کر گھرا جایا کرتا۔ اس کی گردان جھک جاتی۔ اس کی نگاہیں احاطے کے فرش پر آوارہ ہو جاتیں اگرچہ ان میں ہوا یاں سی چلتی رہتیں۔ اور اس کے ہونٹ نہ جانے کیا گلگنا تھے۔ پھر وہ چپکے سے شہزادوں کی سیڑھیاں چڑھ جاتا۔ ”چھپ کوئی سودا تو نہیں منگوانا“، اور اس کی آنکھوں سے گلابی شرارے پھوٹتے اور ہونٹوں سے اف اف کی آواز پیدا ہوتی۔ جیسے اسے بہت کچھ برداشت کرنا پڑ رہا ہو اور شہزاد بے نیازی سے اس کی طرف دیکھتی اور ”نہیں“ کہہ کر یوں بے پرواں سے کسی کام میں لگ جاتی جیسے پتہ ہی نہ ہو کہ رفیق کو اتنا کچھ برداشت کرنا پڑ رہا ہے۔

ارجمند انگرائیڈی کا تمام تر سامان لے کر چوگان میں کھڑا ہو جاتا اور بہانے بہانے شہزادو کی کھڑکی کی طرف دیکھتا رہتا۔ میں رومال ہاتھوں میں اچھاتا۔ اختیاط

سے بنائے ہوئے بالوں کو ریشمیں رومال سے سنبھالتا اور پھر بانسری ہونٹوں تک رکھ کر سراٹھا کریوں اور پر کی طرف دیکھتا جیسے سپیرے کے لوگوں سے سانپ لٹکنے والا ہو۔

لیکن نہ جانے شہزاد کس میٹھی گلی بنی ہوئی تھی کہ اس نے ارجمند کی حرکات کو کبھی در خور اغتنام سمجھا تھا۔ وہ گھر کی میں آتی ہر راہ چلتی ہوئی محلے والی سے کوئی بات چھیڑ لیتی۔ ہر آتے جاتے سے نہیں بس کر بات کرتی مگر اس نے کبھی ارجمند کی طرف آنکھاٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا۔ ارجمند کی ساری کی ساری انگرایندی دھری کی دھری رہ گئی تھی۔ پھر وہ اکتا کر کچھ حولی کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ جہاں کپ اسے دیکھ کر چھلکتی اور کیپ یوں چھڈتی جیسے پاپے کو آگ دھا دی گئی ہو۔ کچھ حولی میں پہنچ کر اس کے انگرایندی میں ازسر نوتاڑ ہو جاتا تھا اور پھرے پر رونق آ جاتی۔

احاطے میں ایلی کے کھڑے ہونے کا سواہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اول تو اس میں اتنی جرات نہ تھی کہ ارجمند سے سکھے ہوئے داؤ کو آزمائے۔ لیکن کبھی ارجمند کے ساتھ کھڑا بھی ہوتا تو کچھ حولی یا باہر کنوں میں کے قریب محلے کے احاطے میں کھڑے ہونا ایلی کے لیے ناممکن تھا اور پھر وہاں شہزاد کے لیے کھڑے ہونا۔

جب سے ایلی نے ریل گاڑی میں اس موگلی گھٹڑی کے پٹ کھول کر اس کی طرف جھانا کا تھا۔ اس پر شہزاد کا اس قدر رعب پڑ گیا تھا کہ اس کی آواز سن کر زگا ہیں جھک جاتیں اور وہ وہاں سے بھاگ لیتا۔ شہزاد کے رو برو جانا تو الگ بات تھی۔

شہزاد کے سامنے ایلی کے شانوں پر منوں بوجھ پڑ جاتا۔ نسوں میں گویا خون جم جاتا۔ دل دھک کرتا۔ جی چاہتا کہ دوڑ کر کسی کو نے میں جا بیٹھے اور اپنے آپ کو محفوظ کرے۔ شہزاد تو یوں دکھائی دیتی تھی جیسے کسی اور دنیا کی مخلوق ہو۔ جیسے وہ ایک ایسی پاکیزہ ہستی ہو جس کی طرف آنکھاٹھا کر دیکھنا جرم ہو۔ اس لیے گھر کے کسی کو نے میں بیٹھ کر مسکراتی ہوئی شہزاد کی طرف حرث ناک زگا ہوں سے دیکھا اور اس

کے قریب تر جانے کی آرزو کو دل میں بسا کر گھنٹوں اس کے قدموں میں بیٹھ رہتا۔ اسے یہ بھی تو معلوم نہ تھا کہ آرزو کرنے کا مقصد کیا ہوتا ہے۔ اسے تو بس شہزادے کے قرب کی آرزو تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اس سے قریب تر ہو جائے اور اسے دیکھ کر شہزادے کی آنکھوں میں ایسی پھل جھڑیاں چلیں جیسے شریف کو دیکھتے ہوئے چلا کرتی تھیں۔ مگر یہاں ممکن تھا اور ممکن ہوتا تھی تو لیکن کیسے ممکن ہو سکتا تھا کہ وہ اپنے دوست کی بیوی کی آرزو کرے۔ لتنی بھری بات تھی۔ لتنی ناجائز۔ اس بات کو بھانے کے لیے اس نے اپنی توجہ دوسری باتوں کی طرف مبذول کرنے کی کوشش کی۔

چند ایک دنوں کے بعد ارجمند نے بھی مغلے کے چوگان میں کھڑا ہونا موقوف کر دیا۔ ”نہ بھی۔“ وہ چلانے والا اپنے بھی بات نہیں۔ اپنے تو پر جلتے ہیں اور بھی ایلی بات یہ ہے کہ پاپکایا کھانا اپنے نصیب میں نہیں۔ اپنے نصیب میں تو انتظار کرنا لکھا ہے۔ بس چھ سال کی بات ہے۔ صرف چھ سال۔ پھر کپ کو جھلکتے دیکھنا۔ اف غضب ہو جائے گا اور دوست رام تو ہم پہلے ہی کر لیں گے۔ اگر مناسب وقت پر رام نہ کر لیا جائے تو یہ بلا قابو میں نہیں آتیں۔ بس حبابوں کی کثوریوں میں گلاب آیا تو سمجھ لو کہ دنیا ہی بدلتی ہے۔ یوں آنکھیں پھیر لیتی ہیں جیسے جانشی ہی نہ ہوں اور وہ شہزاد۔ ارے وہ تو ظالم بے عزتی کر دیتی ہے بالکل بے عزتی۔ اس روز مجھے سے پوچھنے لگی۔ ”کس دا اوپر کھڑا ہے تو۔ کچھ کامیابی کی بھی امید ہے یا ایسے ہی ظالم نے مجھے کاٹ کر رکھ دیا اللہ بے اعتنائی کا یہ عالم ہے کہ ہم کسی گفتگی میں شمار نہیں اور پھر یوں کاٹ کر رکھ دینا۔ بھی واہ۔ نہ بھی اپنے بس کی بات نہیں۔ لیکن تم آزادی سے آ جاسکتے ہو۔ دوست تم مزے میں ہو۔“

ارجمند اور ایلی دوںوں اپنے آپ کو دھوکا دینے کے لیے کپ اور کیپ میں دچپی کا اظہار کرنے لگتے۔ ایلی کہتا ”چلو وہاں چلیں تمہارے گھر میں ہکوری ڈکوری دیکھیں گے۔“ ارجمند مسکرا کر چلاتا۔ ”کیوں دوست ابھی سے چوہا گھڑی پر چڑھنے

لگا۔“ اور وہ دونوں کھڑکی کی درزوں سے مقابل کے گھر میں جھانکتے۔ بزر جنگے کا دروازہ کھلتا اور ایلی محسوس کرتا جیسے کسی مونگیا گھڑی کے پٹ کھل گئے ہوں۔ اس کے شانوں پر بو جھ پڑ جاتا۔ بند بند میں دھنکی سی بجھ لگتی اور وہ گھبرا کر کھڑکی سے ہٹ جاتا۔

”ارے کیا ہے بچہ۔“ ارجمند اسے یوں بے تو جھی برتتے ہوئے دیکھ کر کہتا ”میں عین موقع پر میدان چھوڑنا مردوں کا کام نہیں۔“

اس پر ایلی لا جواب ہو کر بھاگ آتا اور اپنے چوبارے پکے کولنے میں بیٹھ کر اپنی کمتری کو شدت سے محسوس کرتا۔ اس کی نگاہوں میں فرار کی رنگیں رائیں کھلتیں اور وہ ان میں کھو جاتا۔

کچھ روز کے بعد دولت پور سے علی احمد کا خط موصول ہوا۔ جس میں ایلی کو ہدایت کی گئی تھی کہ خط کو دیکھتے ہی وہ فوراً دولت پور آجائے۔ خط پڑھ کر ایلی چونکا اسے ڈرتھا کہیں اپالے سے دولت پور کے کالج میں داخل ہونے پر مجبور نہ کریں۔ اس کی خواہش تھی کہ اسے پھر سے لاہور کے کالج میں داخل کیا جائے۔ کیونکہ لاہور میں وہ آزادانہ زندگی بسرا کر سکتا تھا۔ لیکن جبکہ سے علی احمد کا تباہ دولت پور میں ہوا تھا ایلی کو یہ فکر دامن گیر ہو گیا تھا کہ اسی علی احمد سے دولت پور کے کالج میں داخل ہونے پر مجبور نہ کریں۔ علی احمد کے کمرے سے ڈرتا تھا۔ اسے کشمیر کے سیبوں پر پلی ہوئی ماں کی حنا مالیدہ ہاتھوں سے وحشت ہوتی تھی۔ سب سے بڑھ کر اسے علی احمد کے کمرے سے نفرت تھی۔ جہاں کوئی نہ کوئی کوریا خانم موجود رہتی تھی۔

لیکن علی پور میں رہ کر اپنی زندگی تباہ کرنا بھی تو اسے گراں ہو رہا تھا۔ ایک ان جانی کشکش اسے چکی کے پاؤں کی طرح پیس رہی تھی۔ اس لیے اس نے دولت پور جانا منتظر کر لیا۔ کیونکہ علی پور سے مخلصی پانے کا یہی ایک واحد طریقہ تھا اور وہ مانگے کے سوٹ کیس میں اپنی چند ایک لوڈھیانے کی قمیض ڈال کر دولت پور کی طرف چل

۔۔۔۔۔

دولت پورہ میں علی احمد کے مکان کو دیکھ کر وہ گھبرا گیا۔ وہ ایک پختہ چوبارہ تھا جو ایک چنگلے ووکروں اور ایک کمرہ نما صحن پر مشتمل تھا۔ ایلی نے محسوس کیا کہ وہ مکان گھر نہیں تھا بلکہ تمام تر علی احمد کا کمرہ تھا۔ گھر تو بام آباد میں تھا۔ جہاں ایک وسیع و عریض صحن تھا۔ جس کے پہلوؤں میں چار کمرے تھے۔ ایک ووسرے سے الگ۔ ایک ووسرے سے دور جہاں علی احمد کے ساتھ رہتے ہوئے بھی ان سے دور رہنا ممکن تھا۔ جہاں ایلی ٹین کے سپاہی کے میدان چنگ کی ہماہی سے دور رہ سکتا تھا۔

جہاں وہ اپنی انفرادیت کو بحال رکھ سکتا تھا اور پانی کی بوتل بھرنے کے باوجود داشتنے  
ذہن کو اس کمرے کے تاثرات سے محفوظ رکھ سکتا تھا۔ لیکن دولت پور کا گھر تو سب کا  
سب ایک کمرہ تھا۔ جسے بہت سے حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ جیسے کبوتروں کے  
رہنے کے لیے ڈر بے بنے ہوتے ہیں۔ اُن چڑیواروں کے پردے کھڑے تھے۔  
اس کے باوجود کسی کمرے کی انفرادی حیثیت نہ تھی۔

دولت پور کا چوبارہ دیکھ کر وہ لرز گیا۔ اسے ٹین کے سپاہی اور بڑی کی چیخنے والی  
گڑیا کے ساتھ رہنا پڑے گا نہیں نہیں وہ دولت پور کے کالج میں تعلیم نہیں پائے گا۔  
کبھی نہیں۔

صحن میں چوبے کے سامنے شیم بیٹھی تھی۔ شیر کا وہ سب جو پکنے سے پہلے ہی  
سر ڈا جا رہا تھا۔ وہ شیم اس کے گرد کی بازاری کی دو کاڑی کی مانند کھانے پینے کی چیزیں  
بکھری پڑی تھی۔ گود کی صفحی پنجی کی ناک بہہ رہی تھی۔ قریب ہی بڑی لڑکی حوانگ سے  
فارغ ہونے میں مشغول تھی۔ شیم روٹیاں پکاتے ہوئے صفحی کی ناک پوچھتی۔ بڑی  
لڑکی کے جسم کو کپڑے سے صاف کرتی اور پھر انہیں ہاتھوں میں آئے کاپڑا اٹھا کر  
روٹی پکانے میں مصروف ہو جاتی۔ ساتھ والے کمرے میں علی احمد میلی سی دھوتی  
باندھے ایک بڑے سے رجسٹر میں آ لو اور پیاز کا حساب لکھنے میں مصروف تھے۔ بغلی  
کمرے میں چیزیں گلڈڈ پڑی تھیں۔

ایلی پر ایک گھبراہٹ طاری ہوئی جا رہی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اس مکان  
سے مخلصی پالے۔ اس لیے وہ عقبی کھڑکی میں کھڑا ہو کر پچھواڑے کے مکانات کو  
دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔

سامنے کوٹھے پر کوئی شخص منتظر نہ ہوں سے ادھرا دھر دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہوں  
میں امید کی کرن واضح تھی۔ اس کے انداز سے بے صبری عیاں تھی۔ چند لمحات کے  
لیے وہ کوٹھے پر ٹھلتا رہا۔ پردے کے قریب آ کر کھڑا ہو جاتا۔ نگاہیں اس کھڑکی پر

مرکوز ہو جاتیں جس میں ایلی کھڑا تھا۔ چند منٹ ایلی وہاں کھڑا رہا پھر گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا اور شیم کی طرف متوجہ ہو گیا۔

شیم کے رہنے سبھے کا انداز دیکھ کر اسے غصہ آئے لگا کیا میٹر یکویٹ ایسی ہوتی ہیں۔ کیا کشمیر میں پلی ہوئی عورتوں کا یہی طریقہ ہوتا ہے۔ ایلی کی نظروں میں شیم کی آنکھوں کا فرق زیادہ نمایاں ہوتا جا رہا تھا۔ شیم کے پھرے پر حزن و مال کے آثار واضح تھے۔ رنگ زرد پڑ چکا تھا۔ ”بیچاری۔“ وہ سوچنے لگا۔ ”اس کی زندگی عام بیویوں سے کس قدر مختلف ہے اسے کیا کیا برداشت کرنا پڑتا رہا ہے۔ جب چینی کی گڑیا آ کر چھپتی ہوئی اور تین کامپاہی میدان کالاؤار گرم کرتا ہو گا تو شیم اس بغلی کرے کی چارپائی پر بیٹھ کر کیا سوچتی ہوئی۔ ”اُن کے دل میں پہلی مرتبہ شیم کے لیے ہمدردی پیدا ہوئی۔ میں ان اس جذبہ ہمدردی میں ترس کا عنصر نمایاں تھا۔

سارا دن ایلی پر بیشان رہتا۔ سمجھ میں نہ آتا کہ کیا کرے۔ صحن میں شیم کو روٹی پکاتے ہوئے دیکھ کر اس کی طبیعت ماش کرنے لگتی اور وہ دیوار کی طرف منہ موڑ لیتا۔ کھڑکی سے کو رجھاتی۔ ”بابو جی کہاں ہیں۔“ دروازے سے استانی تہہ بند جھاڑتی ہوئی داخل ہوتی۔ ادھر سے خانم مسکراتی۔ وہ زیادہ دیر وہاں نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ بلآخر وہ بغلی کمرے کی کھڑکی سے اس بے قرار نوجوان کو دیکھنے میں کھوجاتا جونہ جانے کس کے لیے دن بھر چھت پر با دیہ پیائی کرنے میں مصروف رہتا تھا۔ پھر وہ گھبرا کر گھر سے باہر نکل جاتا اور دولت پور کے بازاروں میں بے مصرف گھومتا۔

دولت پور دوسرے شہروں سے کس قدر مختلف تھا۔ بام آبادی تو اور بات تھی وہ تو شہر تھا ہی نہیں بلکہ محض ایک نوا آبادی تھی۔ جہاں غریب لوگ رہتے تھے۔ لیکن دولت پور تو پرانا شہر تھا۔ پھر اس کے بازاروں میں اس قدر ویرانی کیوں تھی۔ اس کی دوکانوں میں وہ بھڑک نہ تھی جو بڑے شہروں کی دوکانوں میں ہوتی ہے۔

بازاروں میں آتے جاتے لوگ سادہ طبیعت کے تھے۔ ان کے لباس میں